شہباز قلندر رحمۃ اللہ علیہ کی حیات و تعلیمات پر خوبصورت کتاب
قلندر مستم
لا اله الا الله محمد رسول الله
محمد اشرف شریف

شہباز قلندر رحمۃ اللہ علیہ کی حیات و تعلیمات پر خوبصورت کتاب

قلندر مست

مصنف

محمد اشرف شریف

نوریہ رضویہ پبلیکیشنز
گنج بخش روڈ ۰ لاہور

تزئین و اہتمام

سید شجاعت رسول شاہ قادری

نام کتاب	قلندرم مستم
مصنف	محمد اشرف شریف
تعداد صفحات	192
بار اوّل	اکتوبر 2002ء
تعداد	1100
کمپوزنگ	words maker Lhr.
سرورق	باھو گرافکس لاہور
مطبع	اے - این - اے پرنٹرز لاہور
ناشر	نوریہ رضویہ پبلی کیشنز لاہور
قیمت	Rs 120

ملنے کا پتہ

نوریہ رضویہ پبلیکیشنز

11 گنج بخش روڈ لاہور فون: 7313885

مکتبہ نوریہ رضویہ

گلبرگ اے فیصل آباد فون: 626046

فہرست

پیش لفظ

حضرت شہباز قلندر کی شخصیت کئی حوالوں سے معروف ہے۔ تاہم اس شہرت کے ساتھ کئی ابہام بھی جڑے ہوئے ہیں۔ ایک بڑا ابہام یہ ہے کہ آپ جو رقص فرمایا کرتے تھے' کیا آج کی دھمال اسی قاعدے پر پیش کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں تقریباً تمام لکھنے والوں نے یہی تاثر دیا ہے کہ آج کی دھمال اور اس دور کی دھمال میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن ہماری تحقیقات کے مطابق ایسا نہیں تھا۔ حضرت شہباز قلندر کا آبائی وطن آذر بائیجان کا قصبہ یا گاؤں مروند تھا۔ آذر بائیجان کے علوم و فنون پر آج بھی ایرانی اکثرات نمایاں ہیں۔ فارسی روایات کے مطابق شہباز قلندر رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں درویش جس قسم کا رقص کرتے تھے اس میں ہاتھ اور کمر کی حرکات اور تیز اچھل کود نہیں ہوتی تھی۔ برٹش میوزیم لندن میں پندرھویں صدی عیسوی کے درویشوں کی رقص کرتے ہوئے ایک تصویر موجود ہے جس میں درویشوں نے دائرے کی شکل میں ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال رکھے ہیں اور اپنا ایک ایک پاؤں آگے کو نکالا ہوا ہے۔ رقص کی ایسی قسم آج بھی برصغیر کے کئی قبائل میں زندہ ہے۔ رقص کی یہ روایت ایرانی ہے۔ برصغیر کی روایت ہندو فلسفہ رقص سے متاثر ہے جس میں ہاتھ' پاؤں' کمر' آنکھ' تھوڑی اور بھنوؤں کے اشاروں کو رقص کا حصہ قرار دیا جاتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے زمانے سے تعلق رکھنے والے جن لوگوں نے حضرت شہباز قلندر کے مزار پر دھمال کو رواج دیا وہ ہندو فلاسفی سے متاثر تھے۔ لہٰذا دیکھا دیکھی وجد اور سرور کی ہموار

کیفیات کو جنم دینے والے قلندری رقص کی بجائے سارے بدن کو جھٹکے دے کر اسے روحانی تجربے کی بجائے جسمانی مشقت کا ذریعہ بنا دیا گیا۔

حضرت شہباز قلندر کے بارے ایک ابہام یہ ہے کہ وہ اثناء عشری شیعہ تھے۔ اس سلسلے میں جناب جلیل سیہوانی صاحب نے اپنی کتاب ''الشہباز'' میں بہت زور مارا ہے لیکن سوائے اس کے کوئی دل لگی دلیل پیش نہیں کر سکے کہ آپ اور آپ کے والد کو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے بڑی عقیدت تھی اور آپ کئی بار زیارت کی غرض سے کربلا معلی بھی گئے۔ یہاں جلیل سیہوانی صاحب نے آپ کے نام کے بارے بیان کیا ہے کہ آپ کے نانا نے شیعہ دشمن حکمرانوں سے محفوظ رکھنے کیلئے آپ کا نام عثمان رکھا۔ یہ بات قطعاً غلط ہے۔ آپ امام جعفر صادق کے فرزند اسماعیل کی اولاد سے تھے۔ آپ کے بزرگ اسماعیلی کہلاتے تھے اور امام جعفر صادق کے دوسرے فرزند امام علی رضا کو امام تسلیم نہ کرتے تھے۔ لہٰذا شیعہ اور سادات دشمن حکمران انہیں اپنا دشمن نہیں بلکہ اپنا معاون اور دوست خیال کرتے تھے۔ دوسرے آپ آذربائیجان جیسے دور دراز علاقے میں پیدا ہوئے جہاں کے متعلق اس دور میں عباسیوں کو اس قدر دلچسپی ہوئی کہ ہر سید گھرانے میں پیدا ہونے والے بچے کو وہ اپنے لئے خطرہ سمجھتے۔ لہٰذا آپ کے نانا نے آپ کا نام عثمان صرف حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے عقیدت کے باعث رکھا۔ یہ نام شیعہ خاندانوں میں نہیں رکھا جاتا۔ لہٰذا واضح ہوتا ہے کہ آپ ہرگز شیعہ نہ تھے۔ آپ کی منقبت میں وہ شعر بھی موجود ہیں جن میں آپ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو بھی خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اس امر کی کسی شیعہ سے ہرگز توقع نہیں کی جا سکتی۔

آپ کے شیعیت سے لاتعلق ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ آپ کے تمام دوست اور ہم صحبت افراد میں سے کوئی بھی شیعہ نہیں تھا۔ بابا فرید گنج شکر، بہاؤالدین زکریا ملتانی اور دوسرے تمام بزرگ حنفی المسلک تھے۔ اگر شہباز قلندر شیعہ ہوتے تو عقائد کا

اختلاف ان کی جلالی طبیعت کو بھی ان بزرگوں کا ہم صحبت نہ بناتا۔

یہی ابہام اوران کی حقیقت کی تلاش نے مجھے حضرت شہباز قلندر مغ بارے لکھنے پر مائل کیا۔اس سلسلے میں اکثر امور کے بارے میں نے ڈاکٹر عبدالمجید سندھی کی تحقیق کو بطور سند لیا ہے۔قلندر پاک جب سندھ تشریف لائے تو یہاں پر ہندو روایات کا راج تھا۔آپ کی تعلیمات نے ہندو ذہن پر ایک خاص انداز میں اثر کیا۔اس بارے جناب مسعود احمد صاحب کا ساٹھ کی دہائی میں لکھا مضمون ہندو معاشرے پر اسلامی اثرات کا جائزہ کے طور پر شامل کتاب ہے۔

کتاب کی تکمیل میں نوید اختر صدیقی کا تعاون بہت قابل قدر رہا۔جس پر میں ان کا مشکور ہوں۔تاہم اس کام کی تحریک کا اعزاز سید شجاعت رسول شاہ کو جاتا ہے جن کا اصرار مجھے آگے بڑھنے پر اکساتا رہا۔

محمد اشرف شریف

مقدمہ

مسلمانوں نے سرزمین ہند پر پہلی صدی ہجری میں قدم رکھا۔ اگرچہ وہ یہاں بیگانے تھے مگر یگانوں کی طرح رہے اور غیروں کو اپنا بنایا۔ فاتح و مفتوح جب اس طرح شیر و شکر ہو کر رہیں تو پھر باہمی اثر پزیری اور شدت اختیار کر جاتی ہے اور پھر اس سر زمین پر مذہب اسلام کوئی اجنبی نہ تھا۔ توریت و انجیل کی طرح یہاں کی مقدس کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیشن گوئیاں موجود تھیں۔ چنانچہ رگھ وید میں "اسم احمد" اور اتھر وید اور یجر وید میں اسم "محمد" موجود ہیں۔ دامن ھمالیہ میں "کپل وستو" کا رہنے والا گوتم بدھ جس کو شاید قرآن عظیم نے "ذوالکفل" سے تعبیر کیا ہے، اپنے خادم نندا کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت دیتا ہے کہ وہ آنے والا نبی اپنے وقت پر آئے گا اور اس کو "میتر یا" (رحمتہ العالمین) کہا جائے گا۔ چنانچہ جب وہ رحمت عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) آیا تو سب سے پہلے لنکا والوں نے اس کی دعوت پر لبیک کہا۔ حالات و تعلیمات کے متعلق معلومات حاصل کرنے کیلئے یہاں سے دو آدمی مدینہء منورہ روانہ ہوئے۔ نامساعد حالات کی وجہ سے یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے وصال کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہء خلافت میں پہنچے۔ فاروق اعظم کے پیکر قدسی کو دیکھا اور گدڑی پوش جہاں آراء و جہاں باں سے متاثر ہو کر چلے۔ جب لنکا واپس پہنچ کر سیرت فاروقی بیان کی تو وہاں کے باشندوں نے فاروق اعظم کی یاد میں پیوند لگے کپڑے پہننے شروع کر دیئے۔ خلفائے

راشدین میں یہ وہی خلیفہء دوم ہیں جن کا ذکر بیاس جی نے راسنگ رام میں کیا ہے۔
سرزمین سندھ پر جب مسلمانوں کا تسلط ہو چکا تو تیسری صدی (۲۷۰) ہجری میں کشمیر
کے راجا مہروک نے ایک عراقی الاصل سندھی عالم کو اپنے دربار میں بلا کر قرآن کریم کی
ہندی زبان میں تفسیر لکھوائی۔ مفسر نے جب ایک آیت کی تفسیر پڑھ کر اس کو سنائی تو وہ
زمین پر سجدہ ریز ہو گیا۔ زار و قطار رونے لگا حتیٰ کہ سارا چہرہ خاک آلود ہو گیا' سر اٹھایا
تو توحید الٰہی کا اعلان کر رہا تھا۔

بہر حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے بعد سرزمین ہندو
پاک میں ایک بیداری پیدا ہو گئی اور دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی خوشیاں ہونے
لگیں۔ ایسے دین کے اثرات کتنے گہرے ہوں گے جس کے استقبال کیلئے یہاں سب
چشم براہ تھے اور جس کو اس سرزمین پر تیرہ سو برس گزر چکے ہیں۔ تاریخ ہند کا اہم تقاضا
تھا کہ ہندو تمدن پر اسلامی اثرات کا جائزہ لیا جائے۔ مؤلف نے یہ کتاب لکھ کر اس
تقاضے کو پورا کیا اور اس تشنگی کو دور کر دیا جو تمدن ہند کے مطالعے کے وقت مورخین اور
ماہرین عمرانیات محسوس کر رہے تھے۔

اسلامی عہد میں سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں
بحر ہند میں فوجی بیڑا داخل ہوا۔ ساتویں صدی عیسوی کے آخر میں مسلمان عرب سے
پہلے جنوبی ہند کے ساحل مالا بار پر آباد ہوئے۔ محمد بن قاسم کے سندھ پر حملے سے پہلے
مسلمان لنکا میں آباد ہو چکے تھے۔ آٹھویں صدی عیسوی کے شروع میں حجاج بن یوسف
(گورنر عراق) نے خاندان بنو ہاشم کے ایک کنبے کو ملک بدر کر دیا تھا جو جنوبی ہند کے
مغربی اور مشرقی سواحل پر آباد ہوا۔ اسی صدی میں عرب بیڑوں نے بھڑوچ اور
کاٹھیاواڑ کی بندرگاہوں پر حملہ کیا۔ محمد بن قاسم نے بھی اس صدی میں سندھ پر حملہ کیا تھا
اور اس طرح سندھ' ملتان' کاٹھیاواڑ گجرات اور لنکا وغیرہ مسلمانوں کے زیر اثر آ
گئے۔ مسلمانوں کی تبلیغی مساعی جاری رہیں۔ چنانچہ نویں صدی عیسوی کا زیادہ حصہ نہ

گزرا تھا کہ مسلمان ہندوستان کے مغربی ساحل پر پھیل گئے۔ چونکہ اس زمانے میں ہندوستان مذہبی اور سیاسی نزاج سے گزر رہا تھا اس لیے سرعت کے ساتھ اسلام کا اثر و نفوذ ہوا۔ چنانچہ مسعودی (۹۱۶ء) کے بیان کے مطابق چال کے مقام پر تقریباً دس ہزار مسلمان عرب آباد تھے۔ ہندوستان کے مشرقی سواحل سے ساتویں صدی عیسوی سے لے کر تیرھویں صدی عیسوی تک کے اسلامی سکے برآمد کیے گئے ہیں۔ تیرھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کی تجارت کو بڑا فروغ ہوا۔ چنانچہ مرزبان فارس ملک الاسلام جمال الدین نے کیال (Kayal) کے مقام پر ایک ایجنسی قائم کی تھی جہاں سے سالانہ دس ہزار گھوڑے درآمد کیے جاتے تھے۔ مسلمان فاتحین اور تاجروں کی پیش قدمی کے ساتھ ساتھ صوفیائے کرام بھی پاک و ہند آتے رہے اور اس طرح مجموعی حیثیت سے ہندوستانی تمدن پر ان حضرات نے دیرپا اثر ڈالا۔

نمالور، شنکر، رام نج (۱۰۰۶ء)، نمبارک، مادھو (۱۱۹۹ء-۱۲۷۸ء) وشنوا سوامی، پلائے لوک اچاریہ اور ویدانت ویسک۔ ان لوگوں نے بھگتی کا پرچار کیا۔ ان کے نظریات اور انداز فکر اسلام کے مرہون منت معلوم ہوتے ہیں۔ وشنو سوامی، نمبارک اور مادھو کے مابعد الطبیعیاتی مباحث نظامی، اشعری اور غزالی کی یاد دلاتے ہیں۔ ان کے علاوہ لنگا یتوں اور سدھاریوں پر بھی اسلام اثر انداز ہوا۔ لنگایتوں کا خدا کے متعلق یہ تصور ہے کہ وہ مطلق اور غیر مرئی اور نور ہے۔ ان کے ہاں ذات پات کی تفریق بھی نہیں اور ازدواجی تعلقات میں لڑکی کی اجازت اور مرضی ضروری ہے۔ خاوند کو طلاق کی اجازت ہے، بیواؤں کے ساتھ حسن سلوک کیا جاتا ہے اور مردوں کو دفن کیا جاتا ہے۔ اسی طرح سدھاریوں کے ان اقوال سے اسلامی اثرات کا پتا چلتا ہے۔

(الف) خدا ماورائے مکان ہے، کیونکہ وہ دور، بہت دور، موجودات عالم سے بالاتر، لامکان میں رہتا ہے اور باوجود اس دوری کے تیرا دل اس کے قدموں کے درمیان ہے۔

(ب) یہ عبادت نہیں کہ مٹی یا تپے ہوئے گارے کے بنے ہوئے بتوں کے آگے سر جھکایا جائے۔

سدھاریوں کے ہاں نسلی امتیازات بھی نہیں۔ یہ اخوت انسانی کے علمبردار ہیں۔ سخت توحید پرست ہیں، بت پرستانہ رسوم کے مخالف ہیں۔ ان کے ہاں فنا فی اللہ کا تصور متصوفہ کے اثرات کی غمازی کرتا ہے۔ ان کے نزدیک ''نور'' حقیقت الحقائق ہے اور ''عشق'' کائنات کی دوسری قوتوں پر فوقیت رکھتا ہے۔

تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز ہی میں مسلمانوں کے ہاتھوں شمالی ہند کی فتح مکمل ہو چکی تھی۔ ان فتوحات نے ہندوستانی تمدن پر گہرا اثر ڈالا۔ چنانچہ چودھویں صدی عیسوی سے گجرات، پنجاب اور بنگال وغیرہ کے مختلف ہندو مذہبی رہنماؤں نے قدیم رسومات کو جو ترک کرنا شروع کر دیا تھا، وہ اسلامی اثرات ہی کا نتیجہ تھا۔

ہندو مذاہب کے ساتھ ساتھ ہندوستانی ادب پر بھی مسلمان اثر انداز ہوئے۔ چنانچہ انہیں کے اثرات کے تحت ابتدا سے پورے ملک میں ایک لسانی امتزاج شروع ہو گیا جس نے ایک عرصے کے بعد اردو کی شکل اختیار کر لی۔ ہندوستانی زبانوں مثلاً ہندی، مرہٹی، بنگالی اور پنجابی وغیرہ پر مسلمانوں نے گہرا اثر چھوڑا ہے۔ ہندو طب اور فلکیات نے بھی مسلمانوں سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔

رامانند غالباً چودھویں صدی کے اواخر میں پیدا ہوا۔ یہ وشنو کی پوجا کیا کرتا تھا۔ اس نے تعصب سے بالاتر رہ کر ہندوؤں کی چاروں ذاتوں کو بھگتی کی تعلیم دی۔ اس کے چیلوں میں کبیر بہت مشہور ہوا۔

رامانند کی تعلیمات نے مذہب بھگتی کے دو مکاتب فکر پیدا کر دیے۔ ایک رجعت پسند اور دوسرا جدت پسند۔ پہلے مکتب خیال میں تلسی داس سرفہرست ہے اور دوسرے مکتب فکر میں کبیر پیش پیش ہے۔ اسلامی اثرات کے تحت کبیر نسلی اور ذاتی امتیازات کا مخالف ہے۔ وہ متصوفہ سے کافی متاثر ہوا ہے۔ چنانچہ دسویں صدی عیسوی میں منصور

علیہ الرحمۃ نے جن مصطلحات کو استعمال کیا تھا وہ کبیر کے ہاں موجود ہیں' مثلاً علم ناسوت' عالم ملکوت' عالم جبروت' عالم لاہوت وغیرہ۔ اسی تاثر کا نتیجہ ہے کہ ایک اندازے کے مطابق کبیر کے اقوال میں تقریباً دوسو عربی اور فارسی الفاظ ملتے ہیں۔

کبیر کا مرکزی عقیدہ ''توحید'' ہے۔ خدا کے متعلق وہ کہتا ہے۔

۱- عقل کا مقام اس حقیقت متحرکہ کی رویت و معرفت سے بہت دور ہے۔

۲- ہر دل میں موجود ہے۔ ہر ایک ظرف میں اس کی جلوہ گری ہے۔

۳- ہاں تمام موجودات تیرے نور سے معمور ہے۔

گورونانک ضلع گوجرانوالہ (مغربی پاکستان) میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ مہتا کالو چند نامی ایک کھتری تھا۔ ابتدا میں اس نے سنسکرت سیکھی' پھر مولانا قطب الدین سے فارسی پڑھی۔ تیس سال کی عمر میں گھربار اور ملازمت کو خیرباد کہہ کر فقیری اختیار کی۔ بعض اطلاعات کے مطابق اس نے فارس وعرب کے بیشتر علاقوں میں سیاحت کی اور مسلم متصوفہ سے ملاقاتیں کیں جس کا اس پر گہرا اثر ہوا۔

گرونانک کا مقصد حیات ہندو مسلم اتحاد تھا۔ وہ دوئی پسند نہ تھا' سب کو ایک دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ وحدپرست تھا۔ خدا کے متعلق اس کا یہ عقیدہ ہے۔

(۱) وہ ناقابل فہم' بیکراں' مختار کل' لازوال و قیوم ہے۔

(۲) وہ وراء الوراء ہے۔ پھر بھی ہر جگہ موجود ہے۔

(۳) اس کے نور سے ہر چیز منور ہے۔

نانک ہندوؤں کی توہم پرستی پر ملامت کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

سب کچھ سہی لیکن اگر تجھ کو خدا کی معرفت نصیب نہیں تو پھر موت مشکیں کس کر تجھ کو مار دے گی۔

ایک جگہ لکھتا ہے:

اس شخص کا ناپاک دل کس طرح پاک ہوسکتا ہے جو پتھروں کی پوجا کرتا ہے۔

گرونانک عقیدۂ حلول کا قائل نہیں، ذات پات کی تفریق کو بھی تسلیم نہیں کرتا، قیامت کا قائل ہے اور عمل صالح پر زور دیتا ہے۔ یہ سب عقائد اسلامی اثرات کے غماز ہیں۔

سولہویں صدی عیسوی کے رشیوں کا جائزہ لیا ہے۔ اس سلسلے میں کبیر اور نانک کے چیلوں میں دھنا، پیپا، سائیں اور ریداس کا ذکر کیا ہے۔ ان کے اقوال سے اسلامی اثرات کا پتا چلتا ہے۔ اسی صدی میں دادو دیال بھی پیدا ہوا۔ اس کے ہاں بھی اسلامی اثرات پائے جاتے ہیں۔ اس نے "ریختہ" اور بگڑی ہوئی فارسی میں شاعری کی ہے۔ مثلاً اس کا یہ شعر:

موجود خبر، معبود خبر، ارواح خبر موجود
مقام چہ چیز است، وادئی سجود

دادو دیال گرو کو معرفت الٰہی کا وسیلہ سمجھتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

"مرشد نے مرید کی روح کو معبود کی راہ سے باخبر کر دیا ہے"۔

وہ خدا کو "ماوراء" "غیر محدود" "واحد" اور "نور" تصور کرتا ہے۔ معرفت الٰہی کو نجات کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اواگون کا معتقد نہیں اور اسلام کی طرح عمل صالح پر زور دیتا ہے۔

ملوک داس (۱۵۷۴ء) بھی سولہویں صدی عیسوی میں گزرا ہے۔ اس نے ظواھر مذہب کی تردید کی اور معرفت ذات، فنائے ذات، گرو پر اعتماد اور عشق حقیقی پر زور دیا۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتا ہے:

جو شخص جذبات نفسانی کو مٹا کر زندگی ہی میں مر جاتا ہے اس کے سامنے حضرت عزرائیل علیہ السلام بھی جھک جاتے ہیں"۔

اسلامی اثرات کے تحت وہ انسانی ہمدردی کا علم بردار ہے، چنانچہ کہتا ہے:

"وہ شخص خدا کا محبوب بندہ ہے جو عناصر خمسہ سے علیحدہ رہ کر پیاسوں کو پانی پلاتا

ہے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ایسے شخص کی عبادت پُرعظمت و پرشکوہ ہے۔

ست نامی فرقے کا بانی بیر بھان (۱۵۴۳ء) بھی اسی صدی میں ہوا ہے۔ وہ سخت قسم کا موحد تھا۔ اس کے فرقے میں ذات پات اور نسلی امتیازات نہیں ہیں۔ یہ لوگ بتوں کے قائل نہیں ہیں۔ ''فنا فی اللہ'' ہونا ان کے نزدیک فرد کی ترقی کا منتہیٰ ہے۔ اس فرقے کے لوگ مسکرات استعمال نہیں کرتے اور چھپا کر خیرات دینا پسند کرتے ہیں۔ یہ فرقہ اسلامی اثرات سے کافی متاثر ہوا ہے۔

اس سلسلے میں ویراگیوں کا ذکر کیا ہے جن کے معتقدات میں اسلامی اثرات نمایاں ہیں۔ مثلاً اوتاروں کو نہ ماننا اور خدا کو تناسخ و حلول سے منزہ سمجھنا۔ اسی طرح نارایتی فرقے کے بانی ھری داس (۱۶۴۱ء) کے معتقدات میں بھی نمایاں ہیں۔ مثلاً بتوں کو نہ پوجنا' مندروں میں نہ جانا اور حمد باری کو عبادت کیلیے کافی سمجھنا' گوسائیں جائی اور اس کے چیلوں میں بھی اسلامی اثرات کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً دن میں پانچ مرتبہ عبادت کرنا' خدا و رسول (علیہ السلام) اور مقربین ملائکہ میکائیل' عزرائیل و جبرائیل (علیہم السلام) کے نام جپنا اور مردوں کو دفن کرنا۔ اسی طرح دھرنی داس (۱۶۵۶ء) کے معتقدات بھی اسلامی اثر کے غماز ہیں۔ مثلاً وہ کہتا ہے:

(۱) اے دھرنی! تخت شاہی دل میں ہے اور سلطان اس پر رونق افروز ہے۔

(۲) شمع تو جسم کے اندر ہے' نہ اس میں بتی ہے' نہ تیل اور نہ لو۔

پران ناتھ (اواخر سترھویں صدی عیسوی) کے ہاں بھی اسلامی اثرات موجود ہیں۔ اس نے بتوں کی پوجا کی مخالفت کی' ذات پات کے امتیازات اور برہمنوں کی برتری کو تسلیم نہیں کیا۔ اس کے رسالے ''قیامت نامہ'' سے اسلامی اثرات کا پتہ چلتا ہے۔ وہ خود کہتا ہے۔

''جو قرآن پاک کہتا ہے وہی میں کہتا ہوں''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہتا ہے۔

''آپ نے آسمان سے بادلوں کو چھانٹا اور آفتاب نور سے دنیا کو منور کر کے اقوامِ عالم کو متحد کر دیا''۔

جکیون' بلا صاحب' کیشو' چرن داس' سہجو' دیا بائی' غریب داس' شیونرائن اور رام سنہی وغیرہ اٹھارویں صدی عیسوی سے متعلق ہیں۔ ان کے ہاں بھی اسلامی اثرات صاف طور پر نمایاں ہیں۔ مثلاً ان لوگوں کے یہ اقوال:

۱- حیف دنیا یہ بھلا دیتی ہے کہ عشق نہیں تو کچھ نہیں (جکیون)

۲- آسمان دل کی پہنائیوں میں اس کی تمثیل جلوہ گر ہے۔ ہاں ہاں' اس کی نظیر نہیں۔ (جکیون)

۳- وہ شخص جو محبوب حقیقی کے پیچھے دیوانہ ہے' لامکان میں جام نوش کرتا ہے۔ (بلا صاحب)

۴- زاہدوں کی صحبت معرفت الٰہی کا ذریعہ ہے۔ (بلا صاحب)

۵- دنیا سے کوچ کے وقت ان میں سے کوئی بھی ساتھ نہ دے گا' ہاں اگر کوئی چیز فائدہ رساں ہو سکتی ہے تو وہ ہری (خدا) ہے۔ (کیشو داس)

۶- ہاں' اپنے بندوں کی آرزوؤں کو پورا کر اور ذرا اپنی آنکھوں سے ان کو دیکھ تو سہی' تیری نگاہیں ان کی سوزش درونی کو ٹھنڈا کر دیں گی۔ (چرن داس)

۷- اے صاحب! عرش پر میری صدائے دعا سن! (غریب داس)

رام سنہی فرقے کے لوگ مورتیوں کی پرستش نہیں کرتے' مذہبی عبادات مسلمانوں سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ ان کے عبادت خانوں میں دن میں پانچ مرتبہ عبادت ہوتی ہے۔ شیونرائنی فرقے میں تدفین کا رواج ہے جو اسلامی اثر کا غماز ہے۔

سہجانند' دولن داس' گلال' بھیکا اور پلٹو داس یہ سب لوگ اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر اور انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں گزرے ہیں۔ سہجانند (۱۷۸۰ء) نے خدائے واحد کی عبادت کی تعلیم دی' مسکرات کی ممانعت کی' ذات پات کے

امتیازات کو روا نہ رکھا اور مورتیوں کی پرستش سے انکار کر دیا۔ دولن داس نے اپنی نظموں میں منصور، شمس تبریز، نظام الدین اور حافظ (رحمہم اللہ) کا ذکر کیا ہے۔ گلال کا خدا کے متعلق یہ عقیدہ ہے۔

''مالک عالم ان کی پہنچ سے بالاتر، تصور سے ماوراء اور نظروں سے بلند ہے''۔

بھیکا توحید وجودی کا مؤید تھا۔ پلٹو داس کے ہاں بھی ذات پات کے امتیازات نہ تھے۔ وہ انسانی قلب کو عرش الٰہی سمجھتا ہے۔ اس نے متصوفہ کے خیالات اور مصطلحات کو اپنے ہاں بیان کیا ہے۔ اس کے اس قول سے اسلامی اثر نمایاں ہے:۔

''پلٹو داس کہتا ہے کہ وہ ہر لمحہ اور ہر سمت مکہ معظّمہ دیکھ رہا ہے۔

مہاراشٹر اور بنگال (غیر منقسم) کے ہندو مصلحین کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں چیتنیا (۱۴۵۸ء) کا ذکر بھی کیا ہے۔ جس کے معتقدات اسلام سے متاثر ہیں۔ چنانچہ اس نے بھی ذات پات کی تفریق کو ختم کر دیا تھا۔ صرف خدائے واحد کی عبادت کی تعلیم دی اور محبت و عشق، خود باختگی اور خود سپردگی پر زور دیا۔ اسی علاقے میں کرتا بھجی فرقہ بھی ہوا ہے۔ اس فرقے میں ایک خدا کی پرستش کی جاتی ہے۔ شراب سے پرہیز کیا جاتا ہے، جمعہ کو مقدس سمجھا جاتا ہے، رنگ و نسل کے امتیازات کو روا نہیں رکھا جاتا اور فرقے کیلئے کوئی علامتی نشان بھی نہیں۔

مہاراشٹر میں نام دیو (۱۲۷۰ء) ہندو یوگیوں میں سرفہرست ہے۔ اس کے گرو کھیچر نے جو اس کو ہدایات دی تھیں اس سے اسلامی اثرات کا صاف صاف پتا چلتا ہے ۔کھیچر کہتا ہے۔

''پتھر کا دیوتا کبھی نہیں بولتا تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ امراض انسانی کو زائل کر دے؟ اس کو دیوتا سمجھا جاتا ہے مگر حقیقی خدا تو اس سے بالکل مختلف ہے۔ اگر یہ دیوتا تمناؤں کو برلاتا ہے تو پھر پتھر لگنے سے ٹوٹ کیوں جاتا ہے؟ وہ لوگ جو پتھر کے دیوتا کی پرستش کرتے ہیں وہ اپنی حماقت سے سب کچھ کھو بیٹھتے ہیں۔''

تکارام (۱۶۰۸ء) بھی مہاراشٹر کا رشی ہے۔ اس کے اقوال سے تو بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمان ہی تھا' مثلاً یہ اقوال:

۱- نہ اس (خدا) کی شکل وصورت ہے' نہ نام اور مکان ہے۔ جہاں ہم جاتے ہیں وہاں وہ حاضر وناظر ہے۔

۲- اے خدا! تو ہی ہمارے لیے سب کچھ ہے' ہاں' ہماری زندگی' ہماری امید اور ہماری چاہ تو ہی ہے۔

۳- ایک ہی آواز میں تو اپنے پرستاوں کے قریب آ جاتا ہے۔ ہاں تکا کہتا ہے تیری رحمت یقینی ہے' تیری طرف سے تو دیر ہو ہی نہیں سکتی۔

۴- بلا شبہ خدا ایک ہے اور بے شک نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک ہیں۔ اے بابا! ہاں' خدا ایک ہے' خدا ایک ہے' خدا ایک ہے...... نہ تو ہے اور نہ میں۔

مسلمانوں کے اثرات کی وجہ سے ہندؤں کی قدیم جمالیاتی قدریں بدل گئیں۔ چنانچہ ریاست جودہ پور میں ران پور کے مقام پر ۱۴۳۹ع میں جو مندر تعمیر ہوا تھا اس میں قدیم روایات سے فرار نظر آتا ہے۔ وادی اراولی کا مندر بھی مسلم اثرات کا غماز ہے۔ اسی طرح گوالیار میں رانا مان سنگھ (۱۴۸۶ء-۱۵۱۶ء) اور اس کے جانشین وکرما دتیا سنگھ (۱۵۱۸ء) کے محلات میں مسلم فن تعمیر کی محرابیں نظر آتی ہیں۔ ۱۵۹۰ع میں راجا مان سنگھ کچھواھا نے برندابن میں گووند دیو کا جو مندر بنوایا تھا اس میں پیش دہلیز پر چمک دار محرابیں مسلم فن تعمیر کی خصوصیات کی حامل ہیں۔ اسی مقام پر ۱۶۲۷ع میں جو مندر تعمیر ہوا تھا اس میں بھی مخروطی مینار' محراب دار طاق مسلم فن تعمیر کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ سولہویں اور سترھویں صدی میں بندیل کھنڈ میں سونا گڑھ کے جینی مندر اور برار میں گاول گڑھ کے قریب مکتا گری کے مندروں میں بھی اسلامی فن تعمیر کے اثرات صاف نمایاں ہیں۔

صوبہء مدراس کے جنوب میں ہندو راجاؤں کی شہری عمارات اور وجیانگر'

چندر گڑھ، مدورا اور تنجور کے محلات میں مسلم فن تعمیر کا اثر نمایاں ہے۔ بالخصوص ان کی محرابیں۔ مدورا میں تیرو ملا یک نائک کا محل سترھویں صدی عیسوی میں تعمیر ہوا۔ اس کو تین گنبدوں والی جامع مسجد کے نقشے پر تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ محل بالکل مسجد معلوم ہوتا ہے۔ اسی صدی میں اودے پور میں امر سنگھ اول (۱۵۹۷ء) کا ''بڑی محل'' جنگ نواس کا محل، ریاست بوندی کا محل، بندیل کھنڈ میں بیر سنگھ دیو کا مندر اور ارچھا اس کی سمادی، راجا مان سنگھ اور جے سنگھ کے تعمیر کردہ منادر مسلم فن تعمیر کے اثرات کے غماز ہیں۔ اسی صدی میں ہندوؤں میں مرنے والوں کی یاد میں چھتریوں کا رواج ہوا جو مسلمانوں کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ اودے پور میں سنگ رام سنگھ کی چھتری، گواردھن میں سورج مل، چھتر سال اور اس کی رانی کملاوتی کی چھتریاں (Cenotaphs) قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح دہلی میں جینی مندر، الورا میں اہلیہ بائی کا مندر اور بنگال میں کنت نگر کا مندر مسلم فن تعمیر سے متاثر ہوئے ہیں۔ بنگال کا مندر مسلم عہد حکومت میں پہلی ہندو تعمیر ہے۔ اس میں گاوڑ اور مالدہ کی مسجدوں کی طرز تعمیر کی پیروی کی گئی ہے۔ یہ مندر ۱۷۴۰ء اور ۱۷۲۲ء کے درمیان تعمیر ہوا۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں مسلم فن تعمیر کے اثرات پورے ہندوستان میں پھیل گئے تھے۔ حتیٰ کہ نیپال تک جا پہنچے تھے، کھٹمنڈو کا مندر اس کا شاہد ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے محلات، منادر اور چھتریاں خواہ وہ مغرب میں جام نگر میں ہوں یا مشرق میں کلکتے میں پنجاب میں سکھوں کی تعمیر کردہ ہوں یا وسط ہند میں جینیوں کی تعمیر کی ہوئی ہوں۔ ان سب پر مسلم فن تعمیر کے اثرات پڑے ہیں۔

چغتائی حکم رانوں سے فن مصوری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ بہزاد کو ہندوستانی مصوروں کے لیے مثالیہ سمجھا جاتا ہے۔ تیموری مکتب نے اجنٹا کی قدیم روایات پر اثر ڈالا۔

فرخ قلماق، عبدالصمد شیرازی، میر سید علی تبریزی اور مسکین کے زیر سایہ ہندو

تلامذہ نے روایاتی طرز میں مہارت حاصل کر لی۔ چنانچہ ''آ ئین اکبری'' میں ان ہندو مصوروں کا ذکر ملتا ہے۔ وسونت، بساون، کیشو لال، مکند، مادھو، جگن ناتھ، مہیش، کھیم کرن، تارا، سان ولبھ، ہری بنس اور رام اور تیمور نامے میں بھی ان ہندو مصوروں کے نام ملتے ہیں: تلسی، سورجن، سورداس، ایشر، شنکر، رام آس، بنوالی، نند، ننھا، جگیون، دھرم داس، نرائن، چترمن، سوراج، دیوجیو، سرن اور گنگا سنگھ۔

شہنشاہ جہاں گیر کے زیر سایہ ہندوستانی مکتب، تقلید سے آزاد ہو گیا۔ اس عہد میں تصویر کشی میں غیر معمولی نفاست پیدا ہوئی اور مناظر میں شکار کے مناظر بالخصوص مقبول عام ہوئے۔ شاہ جہاں کے عہد حکومت میں یہ فن لطیف معراج کمال پر پہنچ گیا۔ تصویر میں خارجی اور داخلی تناسب، تاثر انگیزی، ترتیب، تاریکی پیدا کرنے کے اصول داخل کیے گئے۔ اس دور میں بے شمار ہندو نقاش گزرے ہیں۔ مثلاً کلیان داس، الیاس چترمن، انوپ چتر، رائے انوپ، منوہر وغیرہ۔

دکن، لکھنؤ، کشمیر اور پٹنے کے مصور و قلم کار مسلم فن مصوری کی طرف مائل تھے مگر سکھ مصوروں کے ہاں ہندو اور مسلم فن مصوری کا امتزاج ملتا ہے۔ بہر حال مجموعی طور پر تو ہندو اجنتائی فن کی خصوصیات کا احساس باقی ہے مگر عام طور پر ہندو مصوروں نے مغل مصوروں کی طرح جمال حیات کی تصویر کشی کی ہے۔ چنانچہ اودے پور اور بیکانیر کے راجاؤں نے مسلم فن تعمیر ہی کو نہیں اپنایا بلکہ فن مصوری کو بھی اپنایا ہے۔

فی الحقیقت مسلمان بادشاہوں نے ادب و فن کی سرپرستی کر کے ہندوستان میں ادب نوازی اور فن پروری کی ایک نادر مثال قائم کر دی ہے۔ ہندو شہزادگان نے مسلمان بادشاہوں کی دیکھا دیکھی فن و ادب کو نوازا۔ چنانچہ مغل دربار میں جس طرز کو جنم دیا گیا تھا اسے جے پور، جموں، چمبا، کانگڑا، لاہور اور دور افتادہ تجور کے درباری مصوروں نے مقامی تبدیلیوں کے ساتھ اپنایا اور اس طرح یہ طرز خاص پورے پاک و ہند میں پھیل گیا۔

Life in the desert with its experiences, was all his education,

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نہ تو ماحول سے تاثر کا نتیجہ ہیں اور نہ علمائے یہود ونصاری کے اسباق اور خیالات وافکار پر مبنی ہیں۔ اللہ کی یہ سنت دیرینہ رہی ہے کہ وہ مخلوق کی ہدایت کیلئے منتخبہ نفوس قدسیہ کو اپنے پیام قدسی سے نوازتا رہتا ہے جس کو اصطلاح میں وحی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کا پہلا تجربہ غار حرا میں ہوا۔ بخاری شریف میں آتا ہے: فجنہ الحق (پھر حق آیا) اس کے بعد آتا ہے۔ ''فجاء الملک'' (پھر فرشتہ آیا) اور پہلا سبق پڑھایا گیا:

''اقراء باسم ربک الذی خلق o خلق الانسان من علق o اقراء وربک الاکرم o الذی علم بالقلم o علم الانسان مالم یعلم o''

علم وعرفان کے اس سرچشمے سے درس دیا جارہا ہے۔ جہاں سے انسانیت کو آب حیات ملتا ہے۔ اقبال مرحوم نے عقول انسانی کی بے بسی اور وحی الٰہی کی حکمت عظیم کو خوب بیان فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں:

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہ پر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کار حیات

پھر فرماتے ہیں۔

خوب و ناخوب عمل کی ہو گرہ وا کیوں کر
گر حیات آپ نہ ہو شارح اسرار حیات

عیسائی راہبوں کے پاس اسرار حیات کی کلید کہاں تھی؟ وہ بے چارے تو خود بگل تھے جو خود گرفتار ہو وہ دوسرے کو کیا آزادی کا درس دے گا؟

ڈاکٹر تاراچند تحریر کرتے ہیں:

''وحی نے فریب اور لاعلمی کے نقاب کو چاک کر ڈالا''۔

''فریب'' اور ''لاعلمی'' نبی کی ذات سے مستبعد ہے۔ جس ذات قدسی صفات نے ماحول سے بے نیاز ہو کر حق سے رابطہ قائم رکھا۔ نہ بت پرستی کی طرف مائل ہوئی اور نہ مشرکانہ رسوم اختیار کیں۔ وہ ذات ''فریب خوردہ'' کیسے ہو سکتی ہے۔ البتہ تلاش حق میں اضطراب و بے چینی ضرور تھی۔ اس کو فریب سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن پاک میں سورہ ''ضحیٰ'' میں ایک آیت ہے جس کے معنی ہیں ''اور ہم نے تجھ کو خود رفتہ پایا' پس راہ دکھائی'' (ووجدک ضالاً فھدیٰ) آیت میں لفظ ''ضالاً'' سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے متعلق بعثت سے پہلے کی کیفیت میں غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ اس کے معنی مترجمین کرام نے ''بھٹکا ہوا'' ''بے خبر'' اور ''بھولا ہوا'' کیا ہے اور انگریزی مترجمین نے اس کے معنی ''سرگردان'' اور ''غلط کار'' کیے ہیں۔ چنانچہ جے ایم راڈویل (J.M.Rowdwell) اور ای ایچ پامر (E.H. Palmer) نے ''ضالاً'' کے معنی ''غلط کار'' (Erring) کے ہیں۔ ایم ایم پکتھال (M.M.Pickthal) اور علامہ عبداللہ یوسف علی نے ''سرگرداں'' (Wandering) کیے ہیں۔ شاہ عبدالقادر (م-۱۲۴۳ھ) نے ضالاً کے معنی ''بھٹکتا'' اور شاہ رفیع الدین (م-۱۲۴۹ء) نے ''بھولا ہوا'' کیے ہیں۔ مولانا محمود الحسن اسیر مالٹا اور مولانا نذیر احمد دہلوی نے اوّل الذکر ترجمے کو ترجیح دی ہے۔

مولوی اشرف علی نے ''ضالاً'' کے معنی ''بے خبر'' کیے ہیں۔ لفظ ''ضالا'' کے مذکورہ بالا ترجمے خود قرآن عظیم کی روشنی میں صحیح نہیں معلوم ہوتے۔ چنانچہ سورۃ نجم کی اس آیت سے ہمارے خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

''ماضل صاحبکم وما غویٰ''

''تمہارے صاحب نہ بہکے نہ بے راہ چلے''

اس لیے ہمارے نزدیک شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ (م-۱۱۷۶ھ) کا ترجمہ زیادہ

وقیع ہے۔ موصوف نے ''ضالاً'' کے معنی ''خودرفتہ'' کیے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جوان ہوئے' قوم کے مشرکانہ اطوار اور بے ہودہ رسم وراہ سے سخت بے زار تھے اور ان کے دل میں خدائے واحد کی عبادت کا جذبہ پورے زور کے ساتھ موج زن تھا۔ عشق الٰہی کی آگ سینۂ مبارک میں بڑی تیزی سے بھڑک رہی تھی۔ وصول الی اللہ اور ہدایت خلق کی اس اکمل ترین استعداد کا چشمہ جو تمام عالم سے بڑھ کر نفس قدسی میں ودیعت کیا گیا تھا۔ اندر ہی اندر جوش مارتا تھا لیکن کوئی صاف کھلا ہوا راستہ' مفصل ضابطہ اور دستور العمل بظاہر دکھائی نہ دیتا تھا جس سے اِس عرش وکرسی سے زیادہ وسیع قلب کو تسکین ہوتی۔ اس جوش طلب اور فرط محبت میں آپ بے قرار غاروں اور پہاڑوں میں جا کر رب کو یاد کرتے تھے اور محبوب حقیقی کو پکارتے تھے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے غیب کے اسرار آپ پر کھول دیے اور علوم کان و مایکون عطا کیے۔ اپنی ذات وصفات کی معرفت میں سب سے بلند مرتبہ عنایت کیا۔

ڈاکٹر تاراچند تحریر کرتے ہیں۔

(الف) تصوف کا ابتدائی سرچشمہ مصحف مقدس اور حیات محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ عیسائیت اور نوافلاطونی نظریات نے اس میں بکثرت اضافے کیے۔ ہندومت اور بدھ مت نے بھی مختلف تصورات شامل کیے۔ اسی طرح ایران کے قدیم مذاہب زرتشتی اور مجوسی وغیرہ نے بھی کچھ نہ کچھ اضافہ کیا۔

(ب) جب مسلمانوں کا عیسائیوں کے ساتھ میل جول ہوا تو یہ رجحانات' عبادات میں ذکر (مراقبہ' تسبیح وتہلیل) اور اخلاقیات میں اخلاص' توکل' فقر اور رضا میں جلوہ گر ہوئے۔

(ج) پس کیا تعجب ہے کہ نروان (Narvana) کا تصور' ھشت پہلو مسلک کا قیام' یوگ کی مشق اور مافوق العادت قوتوں سے وقوف' اسلام میں فنا' طریقت' سلوک'

مراقبہ، کرامت اور معجزے کے نام سے پکارا گیا۔

(د) عارف ظاہر شریعت کا مکلّف نہیں رہتا۔

(ہ) سالک فنا سے گزر کر مقام بقا میں پہنچتا ہے۔ یہاں فاعل و مفعول اور حقیقت و مجاز کا دھوکا نہیں رہتا اور دین و شریعت ایک بے معنی چیز بن کر رہ جاتے ہیں۔

(و) تصوف کچھ شعائرِ دین پر تو بہت ہی زور دیتا ہے اور کچھ کو نظر انداز بھی کر دیتا ہے۔

مندرجہ بالا تمام بیانات میں اساسی غلطی یہ ہے کہ مصنف نے تصوف کو شریعت اسلامیہ سے علیحدہ تصور کر کے ہندومت اور عیسائی رہبانیت کا خوشہ چین تصور کر لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف نے تصوف کے لیے لفظ "Mysticism" استعمال کیا ہے جو حقیقت تصوف کا آئینہ دار نہیں کیونکہ اس کے معنی میں عمومیت ہے۔ یہ لفظ دوسری زبانوں میں بھی تھوڑی سی ہجا کی تبدیلی کے ساتھ ایک ہی معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ مثلاً فرانسیسی میں "Mysticisme" اور جرمن میں "Mysticismus" ہے۔ لاطینی میں بھی "Mystic" کو "Mystikos" کہتے ہیں۔ چارلس انڈیل (Charles Annandale) نے اس لفظ کے معنی یہ لکھے ہیں:

"Views or tendencies in religion which aspire towards a communication between man and his maker through the inward perception of mind, more direct than that which afforded us through revelation"

جان اگلوی (Jhon Ogilvie) نے بھی قریب قریب یہی معنی لکھے ہیں۔ ولیم گڈی (William Geddie) نے اس طرح تشریح کی ہے۔

"The habit or tendency of religious thought and feeling of those who seek direct communion with God."

ایف۔ جے۔ فاؤلر (F.J.Fowler) نے لکھا ہے:

"Seeking absorption into God or the Infinite"

تصوف کا مفہوم "Mysticism" سے مختلف ہے۔ صوفی اور Mystic میں فرق ہے۔ اول الذکر کے سامنے ایک لائحہ عمل ہے۔ ایک کھلا راستہ ہے۔ ایک واضح شریعت ہے۔ ثانی الذکر گم کردہ راہ ہے مگر راہ کا متلاشی ہے۔ حقیقت تصوف سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے پروفیسر نکلسن (Nicholson) اور پروفیسر میکڈانلڈ (Macdonald) کو اس میں عیسائی رہبانیت اور یونانی باطنیت نظر آ رہی ہے۔ باوجودیکہ ان کو یہ تسلیم ہے کہ اس کا مبداء اولین قرآن پاک ہے۔ پروفیسر ماسینون (Massignon) نے تصوف کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"Derived from the Quran and the practice of the Prophet".

اور خود ڈاکٹر تارا چند کو بھی یہ تسلیم ہے مگر نہ معلوم کیوں موصوف نے تصوف کو بدھ مت، ہندومت اور عیسائیت سے وابستہ کر دیا ہے۔ اگر ناعاقبت اندیش صوفیہ نے غیر اسلامی باتیں تصوف میں شامل کر لیں تو اس کو حقیقت تصوف سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس کی ذمہ داری خود ان پر ہے۔ خالص تصوف جو اسلامی تصوف ہے۔ اس کی نشوونما قرآن و حدیث کے آغوش میں ہوئی ہے۔

ہم تصوف کی ماہیت کا اجمالی جائزہ اس طرح لے سکتے ہیں۔ ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں: خارجی اور داخلی۔ اسی طرح اسلام کے بھی دو پہلو ہیں۔ خارجی پہلو کو شریعت کہتے ہیں اور داخلی پہلو کو طریقت (اور یہ کوئی شریعت سے علیحدہ چیز نہیں بلکہ شریعت کو برتاؤ میں لانے کا نام طریقت ہے۔ پھر شریعت کو دو شقوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ عبادات و معاملات، عبادات اساسی معتقدات اور خالق و مخلوق کے درمیان رابطے سے عبارت ہیں اور معاملات انسانوں کے باہمی معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی روابط سے عبارت ہیں۔ طریقت تزکیۂ نفس سے عبارت ہے۔ یہ انسان کی روحانی سعادت و

نجات کو اس کے پیش نظر رکھتی ہے۔ قرآن حکیم نے انبیائے کرام کی بعثت کا خاص مقصد ''تزکیہء نفس'' اور ''شفائے صدور'' قرار دیا ہے۔

شریعت و طریقت کے علاوہ ایک تیسری چیز ''حقیقت'' ہے۔ یہ کوئی علم نہیں کشف ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھے کہ طریقت سے جو نور حاصل ہوتا ہے اور اس کی روشنی میں جو کچھ نظر آتا' محسوس ہوتا یا ادراک کیا جاتا ہے وہ ''حقیقت'' ہے۔

خلاصہء کلام یہ ہے کہ:

''تصوف'' شریعت' طریقت اور حقیقت کے مجموعے کا نام ہے۔ اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ ''تصوف'' کو عیسائیت' نوافلاطونیت' ہندومت' زرتشتیت' مجوسیت وغیرہ کسی سے بھی اساسی تعلق نہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ (م-۱۰۳۴ھ) نے صاف صاف لکھ دیا ہے:

طریقت وشریعت عین یک دگراند' سر موئے از مخالفت درمیان ایشاں واقع نیست..........ھر چہ مخالف شریعت است مردود است۔

''تصوف'' کو شریعت سے علیحدہ تصور کرتے ہوئے ڈاکٹر تاراچند نے ذکر' اخلاص' توکل' فقر' رضا' فنا' مراقبہ وغیرہ کو عیسائیت اور ہندومت کے اثرات کا نتیجہ بتایا ہے۔ حالانکہ ان کا مدار قرآن و حدیث پر ہے۔ مثلاً ''ذکر'' کے متعلق قرآن پاک میں آتا ہے:

''یایھا الذین اٰمنوا اذکروا اللہ ذکراً کثیرا''

(ترجمہ) مسلمانو! کثرت سے اللہ کو یاد کیا کرو۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''لا تقول الساعۃ حتی لایقال فی الارض اللہ اللہ''۔

''اخلاص'' کے متعلق قرآن میں آتا ہے:

الا للہ الدین الخالص''

(ترجمہ): خالص فرماں برداری خدا ہی کے لیے ہے۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"ثلاث لایغل علیهن قلب مسلم' اخلاص العمل للہ تعالیٰ' ومناصحة ولاة الأمر' ولزوم جماعة المسلمین"۔

توکل کے متعلق قرآن پاک میں ہے:

(الف) "ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبه".

(ترجمہ): جو شخص اللہ پر بھروسہ رکھے گا تو خدا اس کو کافی ہے۔

(ب) "وعلی اللہ فلیتوکل المؤمنون".

(ترجمہ) اور مسلمانوں کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسا رکھیں۔

(ج) "وعلی اللہ فتوکلوا ان کنتم مومنین."

(ترجمہ) اور اگر تم مومن ہو تو اللہ ہی پر بھروسہ رکھو۔

'فقر' کے متعلق قرآن حمید میں ارشاد ہوتا ہے:

"للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ لا یستطیعون ضربا فی الارض."

(ترجمہ) (خیرات تو) ان حاجت مندوں کا حق ہے جو اللہ کی راہ میں گھر بیٹھے ہیں' ملک میں کسی طرف کو جانا چاہیں تو جا نہیں سکتے۔

اور حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

(الف) "یدخل الفقراء الجنة قبل الانبیاء بخسمائة عام."

(ب) "الفقر فخری والفقر منی"

(ترجمہ) فقر میرے لئے موجب فخر ہے اور فقر مجھ سے ہے۔

"رضا" کے متعلق قرآن کریم میں آتا ہے:

(الف) "رضی اللہ عنھم ورضوا عنه."

(ترجمہ) خدا ان سے راضی اور وہ خدا سے راضی۔

(ب) ''ولسوف یعطیک ربک فترضی''

(ترجمہ) تمہارا پروردگار آگے چل کر تم کو اتنا کچھ دے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے۔

(ج) ''یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الیٰ ربک راضیۃ مرضیۃ''

(ترجمہ) اے روح مطمئن! اپنے پروردگار کی طرف چل' تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔

''فنا'' اور ''بقا'' کے متعلق قرآن حکیم میں آتا ہے:

کل من علیھا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام.

(ترجمہ) جتنی مخلوقات روئے زمین پر ہے سب فنا ہو جانے والی ہے اور صرف تمہارے پروردگار کی ذات باقی رہ جائے گی۔

''مراقبے'' سے مراد ''دھیان جمانا ہے'' اس کے متعلق قرآن مجید میں ہے:

وکان اللہ علیٰ کل شیء رقیبا

اور حدیث پاک میں ہے:

''ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراہ''۔

(ترجمہ) خدا کی اس طرح عبادت کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔

مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ذکر' اخلاص' توکل' فقر' رضا' فنا' بقا' مراقبے وغیرہ کا تعلق قرآن کریم اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے' ہندو مت اور بدھ مت وغیرہ سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔

فاضل مؤلف تحریر فرماتے ہیں:

(الف) حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے "اسلام" (خدا کے آگے سر تسلیم و رضا خم کرنے) کا درس دیا مگر تصوف نے شیخ کے سامنے تسلیم و رضا کا سبق سکھایا۔

(ب) اگر متصوفہ کے متعلق یہ خیال صحیح ہے کہ ان کے ہاں خدا اور بندے کی عبادت ایک ہی حیثیت رکھتی ہے۔

یہاں بھی مؤلف نے شریعت و طریقت کو علیحدہ سمجھتے ہوئے یہ لکھ دیا ہے۔ حالانکہ تصوف کا کوئی عمل دائرۂ شریعت سے باہر نہیں کیونکہ بہ قول مجدد الف ثانی "طریقت و حقیقت خادمان "شریعت اند" تصوف میں شیخ کی اطاعت بہ حیثیت خالق نہیں بلکہ بہ حیثیت محبوب خالق ہے۔ جس طرح قرآن پاک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو محبت کی دلیل بتاتا ہے۔ اسی طرح شیخ کی اطاعت اللہ اور اس کے رسول سے کمال محبت کی دلیل ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سے اللہ کی محبت کی طلب کے ساتھ ساتھ اللہ والوں کی محبت کی طلب کی ہے اور ان اعمال سے لگاؤ کی چاہت کی ہے جو اللہ کی نظر میں پسندیدہ و محبوب ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

"اللھم انی اسئالک حبک و حب من یحبک و حب عمل یقربنی الیک"۔

شیخ عبدالحق محدث دھلوی (۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء) اس حدیث پاک کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"فقرۂ اول خود عین مقصود است و مانا کہ مراد محبت ذاتی است کہ مطلق است از قیود صفات و افعال و انجذاب خاص است باحدیت ذات والا محبت منعم طبیعی ست حاجت بہ طلب و سوال چیست؟ و فقرۂ ثانی اشارت ست با قرب طرق تحصیل آں مطلوب' چہ محبت مردان خدائے کہ بہ کلیت از خود تہی شدہ و از قید ھستی برآمدہ

وبحق باقی گشتہ اند و ظاہر و باطن ایشاں بہ نور الٰہی
برشدہ و مشکوۃ مصابیح ذات گشتہ یا عین محبت اوست یا مستلزم آں"

ترجمہ: فقرہ اول خود عین مقصود ہے اور یقیناً اس سے محبت ذاتی مراد ہے۔ جو صفات و افعال کی قیود سے آزاد ہے اور احدیت ذات سے انجذاب خاص ہے ورنہ منعم کی محبت تو طبعی چیز ہے۔ طلب و سوال کی کیا حاجت؟ فقرہ ثانی اس مطلوب کے حاصل کرنے کے قریب ترین راستے کی طرف اشارہ کرتا ہے اس لیے کہ اہل اللہ کی محبت یا عین خدا کی محبت ہے یا اس کی مستلزم۔ چونکہ یہ وہ لوگ ہیں جو خود سے خالی ہوکر قید ہستی سے آزاد ہوگئے ہیں اور ذات الٰہی سے وابستہ ہوکر باقی ہوگئے ہیں جن کا ظاہر و باطن اللہ کے نور سے معمور ہوگیا ہے۔

سلسلہء عالیہ نقشبندیہ کی اساس تین امور پر ہے۔ توجہ و مراقبہ' رابطہ اور ذکر۔ غالباً فاضل مؤلف کو "رابطہ" کے طریقہء کار سے غلط فہمی ہوگئی ہے۔ "رابطہ" کے متعلق شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:

"دوم طریق رابطہ' و آں توجہ بہ صورت پیر است کہ فنا فی اللہ و باقی باللہ شدہ' چناں کہ غیبت و بے خودی روئے نماید و صورت آں برزخ دانا کہ جہت اسفل اوست از نظر ساقط گردد و در بحر شہود ذات و حضور حق کہ جانب علوی اوست بیفکندا"۔

متذکرہ بالا حدیث پاک میں توجہ و مراقبہ' رابطہ اور ذکر کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:

"دریں حدیث اشارتے بریں سہ طریق می تواں یافت "اسئالک حبک" اشارت بہ طریق اول است کہ طریق توجہ مراقبہ' است "وحب من یحبک" بہ طریق 'رابطہ' "وحب عمل یقربنی الیک" بہ طریق 'ذکر'

ترجمہ: اس حدیث میں ان تین طریقوں کی طرف اشارہ پایا جا سکتا ہے۔
''اسئالک حبک'' (تجھ سے تیری محبت مانگتا ہوں) یہاں طریق اول یعنی توجہ و مراقبے کی طرف اشارہ ہے اور ''حب من یحبک'' (اس کی محبت مانگتا ہوں جو تجھ کو پیارا ہے) یہاں طریق رابطہ کی طرف اشارہ ہے اور ''حب عمل یقربنی الیک'' (اور اس عمل کی محبت مانگتا ہوں جو تجھ سے قریب تر کر دے) یہاں طریق ذکر کی طرف اشارہ ہے۔

فاضل مؤلف تحریر کرتے ہیں:

الف۔حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ سماع کے جواز کے لیے احادیث اور اقوال صوفیہ پیش کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ سماع مذہب میں ایک اہم کردار انجام دیتا ہے۔

(ب) چشتی اور سہروردی دونوں سلسلے رقص و سرود کو ذکر کا لازمی عنصر قرار دیتے ہیں۔

(ج) حقیقت میں تصوف ایک ایسا مسلک ہے جس میں انتہائی خود سپردگی ہے اور جس کا جذبہ عشق ہے۔ شاعری اور رقص و سرود ذریعۂ عبادت ہے اور فنا فی اللہ ہو جانا اس کا منتہائے مقصد ہے۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ ''تصوف'' کا مدار شریعت پر ہے۔ شریعت محمدیہ میں رقص و سرود اور سماع (بامزامیر) حرام ہے۔ اجلہ صوفیہ میں سے کسی نے بھی اس کو مباح قرار نہیں دیا۔ جنہوں نے اس کو اپنا شعار بنایا ان کا عمل شریعت کے مطابق نہ تھا اور یہ قول حضرت مجدد الف ثانی ''ھرچہ مخالف شریعت است' مردود است''۔

''سماع'' کے لغوی معنی تو ''سننے'' کے ہیں مگر اصطلاح تصوف میں اس کے معنی ''قوال کا اپنی فطری آواز سے موزوں اشعار پڑھنا'' ہیں۔ اس میں مزامیر شامل نہیں۔ بعد میں ناعاقبت اندیش صوفیہ نے مزامیر کو شامل کر لیا اور اس طرح لذت نفس کا سامان

مہیا کیا۔ علامہ اقبال نے رقص وسرود کے عدم جواز کی حکمت بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ چوں کہ اسلامی عبادت کا تعلق روحانیت سے ہے اس لیے جذباتیت سے بچنے کیلئے رقص وسرود کو مباح نہیں کیا گیا۔

شیخ مخدوم علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ (م-۴۶۵ھ) محض ''سماع'' سے لطف اندوز ہونے والوں کو ''اہل سعادت'' میں شمار کرتے ہیں اور ''سماع با مزامیر'' سے لذت اندوز ہونے والوں کو ''اہل شقاوت'' میں شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

''آناں کہ صوت داؤد شنیدند بدو گروہ شدند' یکے آں کہ اھل شقاوت بودند ودیگر اھل سعادت۔ آں گروہ بہ مزامیر ابلیس مائل شدند وایں گروہ بہ صوت داؤد بماندند''۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیوں پہلے ارشاد فرمایا تھا:

''لیکونن فی أمتی اقوام یستحلون الحر والحریر والخمرو المعازف''.

(ترجمہ) میری امت میں کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو اپنے لیے زنا' ریشمی کپڑے' شراب اور آلات موسیقی حلال کرلیں گے۔

ناپختہ مسلمانوں کا عمل حجت نہیں ہوسکتا بلکہ شریعت کا حکم حجت قاطع ہے۔ اسلام کو اسی معیار پر جانچا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر تاراچند نے لکھا ہے کہ سلسلہء چشتیہ میں رقص و سرود اور سماع کو ذکر کا لازمی عنصر سمجھا جاتا ہے۔ فی زمانناھذا تو یہی حال ہے مگر اکابرین صوفیہ سراسر اس کے خلاف تھے۔ چنانچہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا (م-۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء) کے حال میں لکھا ہے:

یکے از حاضراں گفت کہ ہم دریں روزھا بعضے از درویشان آستانہ دار در مجمعے کہ چنگ ورباب ومزامیر بود رقص کردند' فرمود'' نیکو نہ کردہ اند' آنچہ

نامشروع است ناپسندیدہ است" بعدازاں یکے گفت چوں ایں طائفہ ازاں مقام بیروں آمدند بایشاں گفتند کہ "شما چہ کردید؟ دراں جمع مزامیر بود سماع چگونہ بشندید و رقص کردید؟" ایشاں جواب دادند کہ "ما چناں مستغرق سماع بودیم کہ ندانستیم ایں جا مزامیر است یا نہ" خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر چوں آں سخن بشنید فرمود "ایں جواب ہم چیزے نیست، ایں سخن درہمہ معصیتہا باید نوشت"۔

(ترجمہ) سلطان المشائخ (خواجہ نظام الدین اولیاء) کی خدمت میں حاضرین میں سے ایک نے کہا کہ آستانہء عالیہ کے چند درویشوں نے ایک ایسے مجمعے میں رقص کیا جہاں چنگ و رباب اور دیگر ساز بھی تھے۔ آپ نے فرمایا "انہوں نے اچھا نہیں کیا، جو چیز نامشروع ہے، ناپسندیدہ ہے"۔ ایک شخص کا بیان ہے کہ جب گروہ اس مجمع سے باہر آیا (اور خواجہ نظام الدین کی خدمت میں حاضر ہوا) تو آپ نے فرمایا "تم نے کیا کیا کہ ایسے مجمعے میں سماع سنا جہاں مزامیر تھے اور رقص بھی کیا؟" انہوں نے جواب دیا کہ ہم سماع سننے میں اتنے مستغرق ہو گئے تھے کہ یہ علم نہ ہوا کہ وہاں مزامیر بھی ہیں یا نہیں۔ آپ نے فرمایا "اس جواب کی کوئی حقیقت نہیں، اس کا بھی گناہوں میں شمار ہوگا۔"

یہ ہیں سلسلہء چشتیہ کے شیخ طریقت حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے نظریات۔ آپ کے خلیفہ مخدوم شیخ نصیرالدین چراغ دھلوی (م-۷۵۷ھ/۱۳۵۶ء) کے متعلق حضرت شیخ عبدالحق محدث دھلوی (م-۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء) فرماتے ہیں کہ آپ ایک محفل میں تشریف لے گئے جب وہاں مزامیر دیکھے تو اٹھ کر چلے آئے۔ جب لوگوں نے خواجہ نظام الدین اولیاء سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: "خوب کرد وحق بہ جانب اوست"۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دھلوی، مخدوم نصیرالدین چراغ دھلوی کے مریدین کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ومنتسبان سلسلۂ مخدوم شیخ نصیرالدین محمود قدس اللہ تعالیٰ سرہ غایت باجتناب و احتراز از شنیدن مزامیر دارند و ایشاں می گویند کہ شیخ فرمودند کہ ہر کہ سماع مزامیر کند از عقد بیعت و مریدی ما برآید''۔

(ترجمہ) مخدوم شیخ نصیرالدین کے سلسلے سے جو لوگ منسلک ہیں مزامیر کے سننے سے بے حد اجتناب کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شیخ نے فرمایا ہے کہ جو مزامیر کے ساتھ سماع کرے گا، ہماری عقد بیعت سے باہر چلا جائے گا اور مریدی سے نکل جائے گا۔

خود حضرت نظام الدین اولیاء کے زمانے میں لوگوں نے سماع مزامیر کو سلسلہء چشتیہ سے منسوب کرنا شروع کر دیا تھا۔

چنانچہ یہ دیکھتے ہوئے آپ نے اپنے خلیفہ مولانا فخرالدین زراوی رحمۃ اللہ علیہ سے ''سماع'' پر ایک رسالہ لکھوایا اور اس میں یہ صراحت کرا دی:

''ہمارے شیوخ رضی اللہ عنہم سماع مزامیر کی تہمت سے بری ہیں، ہمارے نزدیک قوال کا اپنی فطری آواز کے ساتھ اشعار موزوں پڑھنا ''سماع'' ہے!

پھر اس قسم کے سماع کیلئے بھی شرائط ہیں۔ چنانچہ خواجہ نظام الدین اولیاء کے متعلق خواجہ فریدالدین گنج شکر فرماتے ہیں:

> حضرت سلطان المشائخ قدس اللہ تعالیٰ سرہ العزیز می فرمود کہ چند ایں چیز باید تا سماع مباح شود: مسمع، و مستمع، و مسموع، و آلہء سماع، مسمع یعنی گویندہ مردم تمام باشد، کودک نباشد و عورت نباشد، مستمع آں کہ می شنود از یاد حق خالی نباشد۔ و مسموع آں چہ بگویند فحش و مسخرگی نباشد۔ و آلہء سماع مزامیر است، چوں چنگ و رباب و مثل آں۔ می باید کہ درمیاں نباشد۔ ایں چنیں سماع حلال است''۔

(ترجمہ) حضرت سلطان المشائخ فرمایا کرتے تھے کہ جب یہ چیزیں مہیا ہوں تو سماع جائز ہے یعنی مسمع، مستمع، مسموع اور آلہء سماع، مسمع یعنی گانے والا پورا مرد ہو، لڑکا یا عورت نہ ہو۔ مستمع یعنی جو سنتا ہے یہ خدا کی یاد سے خالی نہ ہو۔ مسموع یعنی جو کچھ کہ گایا جا رہا ہے وہ فحش و مسخرگی نہ ہو اور آلہء سماع مزامیر ہیں۔ چنگ و رباب اور اس قسم کی دوسری چیزیں درمیان میں نہ ہوں۔ اس قسم کا سماع حلال ہے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء سے تقریباً اڑھائی سو برس پہلے مخدوم علی ہجویری (م-۴۶۵ھ) نے رقص کے متعلق فرمایا تھا:

"بداں کہ اندر شریعت و طریقت مر رقص را ہیچ اصل نیست، از آں چہ آں لہوے بود باتفاق ہمہ عقلاء چوں مجد باشد، ولغوے چوں بہزل بود، ہیچ کس از مشائخ آں را نہ ستودہ است واندر آں غلو نہ کردہ وھر اثر کہ اھل حشو اندر آں بیارند آں ھمہ باطل بود"۔

(ترجمہ) معلوم ہونا چاہیے کہ شریعت و طریقت میں رقص کی کوئی اصل نہیں ہے۔ چونکہ تمام عقلا کے نزدیک اگر یہ کوشش سے کیا جائے تو لہو ہے اور اگر مذاقاً کیا جائے تو لغو ہے۔ مشائخ میں سے کسی نے بھی اس کی تعریف نہیں کی اور نہ اس میں غلو سے کام لیا ہے اور اہل حشو اس میں جو اثر پاتے ہیں وہ محض باطل ہے۔

سماع (بغیر مزامیر) کے اندر حزم و احتیاط کے بارے میں یہ ہدایت فرماتے ہیں:

"و باید تا چوں سماع کنی پیرے آں جا حاضر بود و جائے از عوام خالی باشد و قوال بحرمت و دل از اشغال خالی، وطبع از لہو نفور و تکلف از میاں برداشتہ"۔

(ترجمہ) اور جب سماع سنا جائے تو مرشد وہاں حاضر ہونا چاہیے اور عوام

سے جگہ خالی ہو۔ قوال کے دل میں حرمت و یکسوئی ہو۔ اس کی طبیعت لہو سے گریزاں اور تکلف سے بے نیاز ہو۔

پھر اس محتاط سماع کا حال بھی یہ ہے کہ اگر سننے والے کا دل مولیٰ تعالیٰ کی طرف مائل ہے تو تقرب حاصل ہوسکتا ہے ورنہ زندقہ وفتنہ میں مبتلا ہونے کا قوی اندیشہ ہے۔

چنانچہ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''السماع وارد الحق تزعج القلوب ای الحق' فمن اصعی الیہ تحقق تحق ومن اصغی الیہ بنفس تزندق''۔

(ترجمہ) سماع وارد حق ہے۔ دلوں کو حق کی طرف مائل کرتا ہے۔ پس جو سماع کو حق سے سنتا ہے' حق کی طرف راہ پاتا ہے اور جو نفس سے سنتا ہے وہ زندقہ میں مبتلا ہوتا ہے اور حضرت ابی بکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''السماع ظاهره فتنة و باطنه عبرة' فمن عرف الاشارة حل له سماع العبرة والافقد استدعى الفتنة و تعرض البلية''۔

(ترجمہ) ظاہر سماع فتنہ ہے اور باطن سماع عبرت۔ جنہوں نے اس اشارے کو پالیا ہے ان کیلئے سماع عبرت حلال ہے۔ وگرنہ تو وہ (دوسروں کے لئے) دعوت فتنہ اور مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے۔

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہاں تک تاکید کی ہے کہ سماع کو عادتاً اختیار نہ کیا جائے۔ فرماتے ہیں:

''شرط آداب سماع آں باشد کہ تانباید نکنی و مرآں راعادت نہ سازی' دیر بدیر بکنی''۔

پھر تاکید مزید فرماتے ہیں کہ مبتدیوں کو سماع سے پرہیز کرنا چاہیے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

''ومن کہ علی بن عثمان الجلابی ام آں دوست تر دارم کہ مبتدیاں را بہ سماعہا

نگذارند تا طبع ایشاں بشولیدہ نہ شود کہ اندران خطرھائے عظیم است و آفت بزرگ"۔

(ترجمہ) میں کہ علی بن عثمان الجلابی ہوں۔ یہ چیز زیادہ پسند کرتا ہوں کہ مبتدیوں کو سماع کی طرف متوجہ نہ کریں تاکہ ان کی طبیعت پریشان نہ ہو کہ اس میں بڑے بڑے خطرات اور بڑی بڑی آفتیں ہیں۔

سماع کے متعلق شیخ احمد سرہندی نے جو کچھ فرمایا ہے اس سے معلوم ہوگا کہ تصوف میں اس کو کس نظر سے دیکھا گیا ہے۔ شیخ موصوف کے ارشادات ہمارے لیے حرف آخر اور حجت قاطع ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔

وآیات و احادیث و روایات فقہیہ درحرمت غنا بسیار است بحدیکہ احصائے آں متعذر است، مع ذالک اگر شخصے حدیث منسوخ یا روایت شاذہ را در اباحۃ سرود بیارد اعتبار نباید کرد، زیرا کہ ہیچ فقیہے در ہیچ وقتے و زمانے فتویٰ باباحۃ سرود ندادہ است و رقص و پاکوبی را مجوز نداشتہ، چناں چہ در ملتقط رسالہ امام ہمام ضیاء الدین شامی مذکور است، و عمل صوفیہ در حل و حرمت سند نیست،...... ایں جا قول امام حنیفہ، و امام ابی یوسف و امام محمد معتبر است...... صوفیان خام ایں وقت عمل پیران خود را بہانہ ساختہ سرود و رقص را دین و ملت خود گرفتہ اند و طاعت و عبادت ساختہ" اولـئک الـذیـن اتخذوا دینھم لھوا ولعبا"۔

(ترجمہ) (سماع مزامیر) کی حرمت میں بہ کثرت آیات و احادیث اور روایات موجود ہیں۔ اتنی ہیں کہ احاطہ کرنا مشکل ہے۔ اگر کوئی شخص کوئی منسوخ حدیث یا روایت شاذہ سرود کی اباحت و حلت میں بیان کرے تو اس پر اعتماد نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ کسی بھی فقیہ نے کسی بھی زمانے میں سرود کی اباحت میں فتویٰ نہیں دیا اور نہ رقص و پاکوبی کو جائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ امام ہمام ضیاء الدین شامی کے رسالے میں مذکور ہے

کہ صوفیہ کا عمل (سرود ورقص کی) حلت وحرمت میں سند نہیں ہے...... یہاں تو امام ابو حنیفہ، امام ابی یوسف اور امام محمد کا قول معتبر ہے...... اس زمانے کے صوفیۂ خام نے اپنے پیروں کے عمل کو بہانہ بنا کر سرود ورقص کو اپنا دین وایمان بنا لیا ہے اور طاعت وعبادت سمجھ لیا ہے۔

ڈاکٹر تارا چند تحریر کرتے ہیں:

(الف) یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں نے بہت سے تصورات ہندوستان سے لیے اور شاید ہندوستان نے بھی اپنے ہی دیے ہوئے تصورات کا عکس اسلام کے ذریعے حاصل کیا اور یہ بھی صحیح ہے کہ عیسائی اور نو افلاطونی تصورات نے اسلام کو بہت متاثر کیا۔

(ب) قدیم ادیان کے نمائندے برہمن مت کے مغلوب ہونے سے مسلمانوں کے بہت ہی ممنون ہوئے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کی ''تہذیب سوزی'' (Vendalism) سے بھی وہ خوش تھے۔

فاضل مصنف کا یہ فرمانا کہ ''شاید ہندوستان نے بھی اپنے ہی دیے ہوئے تصورات کا عکس اسلام کے ذریعے حاصل کیا'' کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ اس دعوے کی کمزوری لفظ ''شاید'' ہی سے ظاہر ہے۔ اگر حقیقت واقعہ یہی ہے تو پھر ''اسلامی اثرات'' بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم یہاں فرانس کے مشہور محقق اور مؤرخ ڈاکٹر گستاؤلی بان (G.Le. Bon) کا بیان نقل کرتے ہیں۔ مؤرخ موصوف اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

اس سات سو سال کے عرصے میں جب سے مسلمانوں کی حکومت ہندوستان میں رہی ہے، مختلف فاتحین نے اس ملک کو زیر کیا۔ جن میں عرب، افغان، ترک اور مغل شامل ہیں لیکن ان سب کا مذہب اسلام تھا اور ان کے کل نظامات شریعت محمدی پر مبنی تھے۔ ان فاتحین نے نہ صرف ہندوستان کو فتح کیا بلکہ اپنا مذہب، اپنی زبان اور اپنی

صنعت اس ملک میں پھیلائی اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ عظیم الشان تغیرات جو انہوں نے پیدا کیے اس وقت بھی موجود ہیں اور پانچ کروڑ ہندو اسلام کے پیرو ہیں۔

ایک مدت تک یورپ کے احسان فراموشوں نے مسلمانوں کے احسانات کو چھپائے رکھا لیکن اب حالات کچھ اور ہیں اور اس حقیقت کا کھل کر اعتراف کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ جان ولیم ڈریپر (John William Draper) لکھتا ہے:

"Injustice founded on religious rancour and national conceit cannot be perpetuated for ever... The Arab has left his intellectual impress on Europe, as, before long, Christendom will have to confess".

فاضل مؤلف نے مسلمان فاتحین کے لیے لفظ "Vendalism" استعمال کیا ہے جس کے معنی ''تہذیب سوزی'' کے آتے ہیں۔ تعجب ہے کہ وسعت نظر اور وسعت علم کے ہوتے ہوئے مؤلف موصوف نے اس قسم کا نامناسب لفظ استعمال کیا۔

یورپ میں نشاۃ ثانیہ انہی ''تہذیب سوزوں'' کی مرہون منت ہے۔ رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffault) لکھتا ہے:

"It was under the influence of Arabian and Moorish revival of culture and not in the 15th century, that the real Renaisance took place. Spain and not Italy, was the cradle of the rebirth of Europe.

دور جدید کے عظیم مؤرخ پروفیسر فلپ کے۔ ھٹی (Philip K. Hitti) نے بھی لکھا ہے:

"Moslem Spain wrote one of the brightest chapters in the intellectual history of Mediaval Europe. Between the

middle of 8the and the beginning of 13the centuries... the Arab speaking peoples were the main bearers of the torch of culture and civilization througout the world."

آخری جملہ قابل غور ہے کہ

''آٹھویں اور تیرھویں صدی عیسوی کے درمیان عرب ساری دنیا میں تہذیب و تمدن کے مشعل بردار تھے''۔ یورپ کے مختلف فاضلوں نے مسلمانوں کی تمدن افروزی اور تہذیب نوازی کو سراہا ہے۔ چنانچہ باسورتھ اسمتھ (Bosworth Smith)' ایس۔ٹی۔آرنلڈ (S.T.Arnold) الفرڈ گیام (Alfred Guillaume)' جی۔بی۔ٹرینڈ (G.B.Trend) وغیرہ نے ان حقائق پر روشنی ڈالی ہے۔ رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffault) کا یہ قول اپنی جگہ بڑا وقیع ہے۔ وہ لکھتا ہے:

....There is not a single aspect of European growth in which the decisive influence of Islamic Culture is not traceable."

جہاں تک یونانی اور نو افلاطونی تاثرات کا سوال ہے۔ اسپنگلر (Spengler) کے جواب میں علامہ اقبال کا یہ قول کافی ہے:

....the anti-classical spirit of the modern world has really arisen out of the revolt of Islam against Greek thought."

نوافلاطونی تصورات کی مخالفت وتردید میں اشراقی اور ابن تیمیہ پیش پیش ہیں۔ تہذیب وتمدن کے متعلق اسلامی نظریے کی وضاحت پکتھال (Pickthal) نے بڑی خوبی کے ساتھ کی ہے جو یاد رکھنے کے قابل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"The Culture of Islam aimed not at beautifying and

refining the accessories of human life. It aimed at beautifying and exalting human life itself."

(ترجمہ) اسلامی تمدن کا یہ ہرگز مقصد نہیں کہ وہ حیات انسانی کے حشو و زوائد کو جمیل و حسین بنائے۔ اس کا قصد خاص تو یہ ہے کہ خود انسانی زندگی کو حسین و رعنا بنائے اور بلند تر کر دے۔

فاضل مؤلف تحریر فرماتے ہیں:

اسی زمانے میں (یعنی چودھویں صدی عیسوی میں) مسلمانوں کے سلسلہ ہائے طریقت، مسلم اہل قلم اور شعراء ہندو ممارسات اور معتقدات کی طرف مائل ہونے لگے اور بعض حالات میں تو وہ ہندو دیوتاؤں کی پرستش کو اپنانے کی حد تک پہنچ گئے۔

فاضل مؤلف نے اپنے قول کے لیے کوئی برھان پیش نہیں کی۔ مناسب تھا کہ موصوف چند مثالیں پیش کر دیتے تا کہ قارئین مطمئن ہو سکتے۔ جہاں تک سلسلہ ہائے طریقت کا سوال ہے۔

چودھویں صدی عیسوی میں ایران و عراق سے مشہور سلاسل میں چشتیہ، سہروردیہ اور فردوسیہ ہندو پاک آئے۔ ان میں سے کوئی سلسلہ بھی ہندو معتقدات کی طرف مائل نہ تھا۔ سلسلہء چشتیہ کے بزرگوں نے تبلیغ اسلام میں جو نمایاں کردار انجام دیا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ چودھویں صدی عیسوی میں مسلم علماء و شعراء کا ہندو معتقدات کی طرف مائل ہونے کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے اسلام کے اس طویل دور میں کسی عالم کا برگشتہ ہو کر ہندو مذہب اختیار کرنا یا ان کے دیوتاؤں کی پرستش کرنے کی مثال شاید ہی مل سکے۔ البتہ سولہویں صدی عیسوی میں اکبر کے دور میں خبط الحواسی کا دور آیا تھا۔ جہاں گیر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض علاقوں میں جاہل مسلمان ہندو دیوتاؤں کی منت مانا کرتے تھے۔ سو اسلام کی نظر میں ان کا یہ فعل مشرکانہ ہے۔ وہ مسلمان جو کسی دیوتا کی پرستش کرتا ہے، کسی طرح مسلمانوں کی فہرست میں

شامل نہیں کیا جا سکتا۔ خواہ وہ کتنا ہی اسلام کا دعویٰ کرے۔ کفر و اسلام میں ما بہ الامتیاز خدا اور غیر خدا کی پرستش ہے۔ اسلام کا خدا بڑا غیرت مند ہے۔ وہ عبادت میں غیر خدا کی شرکت برداشت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ قرآن حمید میں ارشاد ہوتا ہے:

" ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر مادون ذالک لمن یشاء ومن یشرک باللہ فقد افتری اِثما عظیما"۔

(ترجمہ) اللہ اس کو معاف کرنے والا نہیں کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے، ہاں اس کے علاوہ جس کو چاہے معاف کر دے اور جس کسی نے خدا کے ساتھ شریک کیا اس نے خدا پر بڑا طوفان اٹھایا۔

ایک جگہ اور ارشاد ہوتا ہے:

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر مادوّن ذالک لمن یشاء و من یشرک باللہ فقد ضل ضلالاً بعیدا۔"

(ترجمہ) خدا کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے تو خدا اس کو معاف نہیں کرتا۔ البتہ اس کے ماسواء جو چاہے معاف کر دے اور جس نے خدا کے ساتھ کسی کو شریک کیا وہ بہت دور بھٹک گیا۔

اپنے اور بیگانے سب ہی اسلام کی توحید خالص کے مداح ہیں۔ چنانچہ آئزک ٹیلر (CanonIsaac Taylor) لکھتا ہے:

"In the resignation to God`s will.....the Muslims set us a pattern we should do well to follow."

بوسورتھ اسمتھ (Bosworth Smith) ایف-اے-ایچ ولیم (F.A.H. Wiliam)، ڈبلیو۔ایچ۔ ٹی گارڈنر (W.H.T.Gairdner) اور تھامس کارلائل (Thomas Carlyle) نے اسلامی توحید کو سراہا ہے۔ ان کے علاوہ ٹالسٹائی، سر ولیم میور، پروفیسر ماونٹ، امیڈ ورمنگھم، ڈاکٹر ایسٹن، فالٹیر، گاستاف لایاں، جارج برنارڈ شا

وغیرہ نے اسلام توحید کو سراہا ہے۔

مخالفین پر سب وشتم، غیر مسلمانوں سے بغض وحسد اور دیگر مذاہب کے ساتھ عدم رواداری کا برتاؤ اور مصلحت وقت کے تحت مجبوراً تعصب کو ترک کر دینا نہ اسلام کو سکھایا اور نہ مسلمانوں کا شیوہ رہا۔ اسلام نے مخالفین پر ملامت کرنے سے روکا ہے۔ غیر مسلموں بلکہ تمام انسانوں سے انسانیت کی بنیاد پر اللہ کیلئے دوستی اور محبت کا برتاؤ رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

''تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ عام لوگوں کیلئے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے اور جب تک وہ انسان سے صرف خدا کیلئے محبت نہیں کرتا۔''

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

''الانسان اخ الانسان''

کہ ہے ساری دنیا کنبہ خدا کا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تاریخ عالم میں بالعموم اور تاریخ اسلام میں بالخصوص ایک عظیم الشان مثالیہ (Ideal) کی حیثیت رکھتی ہے۔ ملت اسلامیہ نے جو کچھ سیکھا ہے، آپ ہی سے سیکھا ہے۔ تاریخ کے طلبہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ابتدا عہد نبوت میں اہل مکہ نے آپ کے ساتھ کیا کچھ نہ کیا۔ جو کچھ نہ کرنا تھا، کیا۔ مگر جب سن ہجری ۸ (۶۳۰ء) میں یہ پیکر قدسی (صلی اللہ علیہ وسلم) مدینہ منورہ سے چل کر فاتحانہ انداز سے شہر مکہ میں داخل ہوتا ہے تو شاید دنیا والوں کو یہ توقع ہو کہ آج دشمنوں سے بدلے لیے جائیں گے اور مکے کی گلیوں میں خون کی ندیاں بہیں گی۔ مگر نہیں۔ جو کچھ ہوا اس نے عالم کو حیرت میں ڈال دیا اور آج تک دنیا انگشت بدنداں ہے کہ یہ سب کچھ ہوا کیسے؟ مگر ہوا اور یہ سب اس عرش وکرسی سے وسیع قلب کے ایک گوشے کی جلوہ گری تھی۔ تمام دشمنوں کو معاف کر دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ دشمنوں کے گھر کو دار الامان

بنادیا گیا۔(من دخل دار ابی سفیان کان آمنا)اپنی جاگیروں کو دشمنوں کے سپرد کر دیا۔اس سے بڑھ کر اور کیا رواداری اور مہربانی ہوگی۔ جنگ تھی تو اللہ کیلئے اور یہ دوستی ہے تو اللہ کے لیے۔نہ بے وجہ الفت' نہ بے وجہ نفرت' جچی اور تلی دشمنی اور محبت۔ فاتحہ مکہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدیم المثال دریا دلی کو بیگانوں نے بھی سراہا ہے۔چنانچہ سٹینلے لین پول (Stanley Lane Poole) کہتا ہے۔

"Facts are hard things; and it is a fact that the day of Mohammad`s greatest triumph over his enemies was also the day of his grandest victory over himself. He freely forgave the Qureysh all the years of sorrow and cruel scorn they had inflicted on him: he gave an amnesty to the whole population of Mekka."

ایس۔پی اسکاٹ (S.P.Scott) لکھتا ہے:

"His magnanimity and the profound knowledge of human heart, which stamped him a leader of men, were evidenced by his noble conduct and princely liberation to the Quraish after the Conquest of Mekka."

ملک شام کی طرف جانے والی اسلامی افواج کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہدایات دی تھیں۔اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پیکر قدسی کی رحمت و رافت سے میدان جنگ بھی محروم نہیں۔حالت جنگ میں اقوام عالم نے جو کچھ کیا وہ کوئی چھپی ہوئی چیز نہیں۔دور جدید جس کو تہذیب کا دور کہا جاتا ہے اس میں کیا کچھ نہ ہوا۔پہلی اور دوسری جنگ عظیم اس کی شاہد ہے۔پھر آئے دن جو کچھ ہوتا رہتا ہے وہ بھی دنیا کے سامنے ہے۔تاریخ عالم میں کوئی ایسی مثال نہیں مل سکتی کہ کسی فوج کے

کمانڈر نے اس کو اس قسم کی ہدایات دی ہوں۔ شام کی طرف فوجیں روانہ ہو رہی ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہدایت دے رہے ہیں:

"اللہ کا نام لے کر خدا کے دشمنوں سے ملک شام میں لڑائی لڑو۔ وہاں تمہیں خانقاہوں میں گوشہ نشین راہب ملیں گے۔ خبردار! ان سے تعرض نہ کرنا۔ ان کے علاوہ بعض ایسے (لوگ) ملیں گے جن کی کھوپڑیوں میں شیطان نے گھونسلے بنا رکھے ہیں۔ سو تلوار سے ان کا قلع قمع کر دو۔ دیکھو! عورت، شیر خوار بچے اور بوڑھے کو قتل نہ کرنا۔ نہ کھجور یا دوسرا درخت کاٹنا۔ نہ کوئی عمارت مسمار کرنا۔"

ڈاکٹر ھانس کروسے (Hans Kruse) اسلام کے اصول حرب پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"According to these the fighters for the sake of faith and religion are not allowed to kill women, children, aged persons, invalids, paralytics, monks and hermits and those who are non-belligerents. Unnecessary destruction, devastation etc, is as much forbidden as the killing of hostages."

مشو نے بھی حالت جنگ میں اسلام کی اس نرمی کا ذکر کیا ہے۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے بھائی فرخ بن شخسان جن کا تعلق زرتشتی مذہب سے تھا۔ ان کو درگاہ رسالت سے امان ملی اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے آنحضرت کی طرف سے عہد نامہ لکھا۔ اس میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں:

"جو شخص ان سے فیاضانہ برتاؤ کرے گا وہ گویا مجھ سے فیاضانہ سلوک کرے گا اور اس کا اجر اللہ سے پائے گا اور جو شخص ان کو تکلیف پہنچائے گا وہ گویا مجھے تکلیف پہنچائے گا اور قیامت کے دن میں اس کا دشمن ہوں گا۔"

غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دریا دلی اور فیاضانہ برتاؤ کے کس کس پہلو کو اجاگر کیا جائے۔ آنحضرت کی سوانح حیات میں یہ بات قابل غور اور تعجب خیز ہے کہ گو ہر جنگ میں شریک رہے لیکن کسی دشمن کو اپنے ہاتھ سے قتل نہیں کیا۔

''وما ارسلنک الا رحمتہ اللعالمین'' کی یہ زندہ مثال ہے۔

ڈاکٹر گستاف وائل (Gustav Weil)' ڈاکٹر ڈبلیو-سی ٹیلر (W.C. Taylor) اور پروفیسر ایس پی اسکاٹ (S.P. Scott) وغیرہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انسانیت کے ساتھ اس دریادلانہ اور فیاضانہ برتاؤ کو سراہا ہے۔

خلیفہء اول حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جو فوجیں ملک شام بھیجی تھیں ان کو وہی ہدایات دیں جو اس سے پہلے آنحضرت نے دی تھیں۔ خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب بیت المقدس فتح کیا تو وہاں کے باشندوں کے ساتھ جو آپ نے معاہدہ کیا تھا اس کی دفعات کی تاریخ میں مثال ملنی مشکل ہے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کا اپنے مخالفین اور دشمنوں کے ساتھ کیا فیاضانہ سلوک رہا ہے۔ معاہدے کے آخر میں یہ الفاظ ملتے ہیں:

''یہ وہ امان ہے جو خدا کے غلام میر المومنین عمر نے ایلیا کے لوگوں کو دی۔ یہ امان ان کی جان' مال' گرجا' صلیب' تندرست و بیمار اور ان کے تمام مذہب والوں کے لیے ہے۔ اس طرح پر کہ ان کے گرجاؤں میں نہ سکونت کی جائے گی' نہ وہ گرائے جائیں گے' نہ ان کے احاطے کو کچھ نقصان پہنچایا جائے گا' نہ ان کے صلیبوں اور ان کے مال میں کچھ کمی کی جائے گی۔ مذہب کے بارے میں ان پر جبر نہیں کیا جائے گا' نہ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا۔''

جنگ یرموک میں شرکت کیلئے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم کے مطابق حضرت ابوعبیدہ ابن جراح رضی اللہ عنہ ملک شام کے مفتوحہ علاقے کو چھوڑ کر چلے تو انہوں نے غیر مسلموں کی جزیہ کی رقم واپس کر دی۔ اس انصاف پسندی سے متاثر ہو کر

وہاں کے باشندوں نے دعا دی:

''خدا تم کو ہم پر حکومت کرنا نصیب کرے! اور تم کو رومیوں پر فتح یاب کرے! اگر اس موقع پر وہ لوگ ہوتے تو ہم کو کچھ نہ دیتے بلکہ ہمارے پاس جو کچھ باقی رہ گیا تھا وہ بھی لے لیتے۔''

امویہ اور عباسیہ دور حکومت میں غیر مسلموں کے ساتھ جو رواداری سلوک کیا گیا وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ (T.W.Arnold) نے اپنی کتاب "The Preaching of Islam" میں اس کو مفصل بیان کیا ہے۔ ہم وہیں سے چند حقائق بیان کرتے ہیں:

''حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۶۶۱ء-۶۸۰ء) نے اپنی حکومت میں بہت سے عیسائیوں کو ملازم رکھا۔ خلیفہ عبدالملک (۶۸۵ء-۷۰۵ء) کا درباری شاعر الاخطل عیسائی تھا۔ سینٹ جان دمشقی کا باپ خلیفہء موصوف کا مشیر خاص تھا اور سلومویہ (Sulmuyah) نامی ایک عیسائی معتمد حکومت تھا۔ خلیفہ المعتصم (۸۳۳ء-۸۴۲ء) کے عہد حکومت میں ابراہیم نامی ایک عیسائی خازن تھا اور خود خلیفہ کے بھائی شہزادہ عبدالعزیز کا استاد ادسا (Edessa) نامی ایک غیر مسلم تھا۔ خلیفہ المعتضد (۸۹۲ء-۹۰۲ء) کے عہد حکومت میں ایک عیسائی عمر بن یوسف انبار کا گورنر تھا۔ خلیفہ الموفق (۸۷۰ء-۸۹۷ء) کے عہد خلافت میں اسرائیل نامی ایک غیر مسلم ناظم عسا کر تھا اور ایک غیر مسلم مالک بن الولید معتمد حکومت تھا۔ خلیفہ المقتدر (۹۰۸ء-۹۳۲ء) کے دور خلافت میں ایک عیسائی' دفتر جنگ کا انچارج تھا۔ خلیفہ ہارون الرشید کا درباری طبیب جبریل نامی ایک غیر مسلم تھا۔ اس طبیب کو دو لاکھ اسی ہزار درہم سالانہ ملتے تھے۔ اس کے علاوہ آٹھ لاکھ درہم خصوصی طور پر دیئے جاتے تھے۔ ایک اور غیر مسلم شاہی طبیب تھا جس کی تنخواہ بائیس ہزار درہم تھی۔

عبدالعزیز بن مروان کے زمانے میں حلوان میں ایک قبطی گرجا بنایا گیا۔ خلیفہ

ولید (۷۰۵ء-۷۱۵ء) کے حکم سے انطاکیہ میں یعقوبی گرجا بنایا گیا۔ (۷۱۱ء) دسویں صدی عیسوی میں قسطاط میں ابو سیفین کا خوبصورت گرجا تعمیر ہوا۔ خلیفہ الظاہر (۱۰۲۰ء-۱۰۳۵ء) کے عہد خلافت میں جدے میں نیا گرجا تعمیر ہوا۔ خلیفہ الناصر (۱۱۷۰ء-۱۱۸۰ء) کے دور حکومت میں بہت سے نئے گرجے تعمیر ہوئے۔ ۱۱۸۷ھ میں فسطاط میں ایک نیا گرجا حضرت مریم علیہا السلام کے نام نامی سے معنون ہوا۔"

غیر منقسم ہندوستان کے اسلامی دور میں غیر مسلموں کے ساتھ جس قسم کا برتاؤ کیا گیا' خود ان کا وجود اس کا شاہد ہے۔ مسلمان فاتحین اگر یہاں کے رہنے والوں سے دشمنی اور تعصب کا برتاؤ کرتے تو اس برصغیر کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا اور یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان کے جو مقامات دارالحکومت رہے ہیں وہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور غیر مسلم اکثریت میں ہیں۔ ایک ہندو فاضل نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ مسلمانوں کی رواداری کی بین دلیل ہے۔ ہندوستان کے فاتحین میں محمود غزنوی کو ہندو کش فاتح کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ مگر تاریخ کے طلبہ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ اس فوج میں غیر مسلموں کے فوجی دستے تھے۔ ڈاکٹر تارا چند نے اس کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے:

"ہندوؤں کی ملازمت مسلمانوں کی حکومت کا جزو لازم تھی۔ محمود غزنوی کے پاس بہت سے ہندو فوجی دستے تھے جو اس کی طرف سے وسط ایشیا میں لڑے اور یہ اس کا ہندو سپہ سالار تلک ہی تھا جس نے محمود کے مسلم سپہ سالار انیالتگین کی بغاوت کو فرو کیا۔ جب قطب الدین ایبک نے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تو اس نے ہندو ملازمین کو بحال رکھا۔"

اکبر بادشاہ کا دور تو غیر مسلموں کے خاص عروج کا زمانہ تھا۔ اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ جن کو ہندو بیرون ہند کے مؤرخوں نے بدنام کرنے کی سعی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ان کا سلوک بھی غیر مسلموں کے ساتھ بڑا روادارانہ تھا۔ بلکہ دشمنوں تک سے

درگزر کیا ہے۔ جب شیوا جی دربار میں حاضر ہوا اور بادشاہ کے گستاخانہ پیش آیا تو بادشاہ نے تو درگزر کیا مگر راجا جسونت سنگھ نے سزا کی سفارش کی۔ واقعہ یہ ہے:

"بیگم صاحبہ نواب جعفر خاں (وزیر اعظم) اور راجا جسونت سنگھ جی نے بہت اصرار کے ساتھ بادشاہ جی کے حضور عرض کی کہ سیوا کیا چیز ہے جو دربار شاہی میں اتنی بے ادبی اور عدول حکمی کر رہا ہے اور حضرت درگزر فرما رہے ہیں۔ ایسے بھومیے (زمیندار) تو بہت سے آئیں گے۔ اگر سب ایسی ہی بے ادبی کریں گے تو ملکی نظام کیسے برقرار رہے گا؟ اور جب یہ خبر ملک بھر میں پہنچے اور پھیلے گی تو اوروں کو بھی ایسے ہی حوصلے ہوں گے۔ جسونت سنگھ جی نے کہا کہ اس بے ادبی کی سزا ضرور دینی چاہیے۔"

گزشتہ تاریخی واقعات کو چھوڑ کر اگر اس زمانے میں اسلامی سلطنتوں کا جائزہ لیا جائے تو غیر جانبدارانہ طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہاں غیر مسلموں کو مکمل آزادی حاصل ہے اور ان کے ساتھ ہمیشہ فیاضانہ و روادرانہ سلوک کیا جاتا ہے۔ کوئی غیر مسلم، غیر مسلم ہونے کی بنیاد پر ظلم و تشدد کا شکار نہیں ہوتا۔ برخلاف اور حکومتوں کے کہ باوجود دعویٰ لامذہبیت کے مسلمانوں کے ساتھ عملی اور نظری طور سے جو کچھ ہو رہا ہے، انصاف پسندوں کی نظر سے اوجھل نہیں۔

المختصر اسلامی رواداری ہمہ گیر اور عالم گیر ہے۔ دنیا کے فضلاء نے اس کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ ڈی۔ ڈی سینٹیلانا (D.D.Santillana) اسلامی قانون پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس کا مقصد فلاح انسانی ہے:

Accordingly, law, divine in its origin, human in its subject matter, has no other end but the welfare of man."

پھر اسلامی حکومت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"The object of Government is to lead men to prosperity in this world and the salvation in the next."

تھامس کارلائل (Thomas carlyle) اسلامی مساوات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"Islam, like any great......and insight into the essence of man is a perfect equaliser of men."

ٹی۔ڈبلیو۔آرنلڈ (T.W.Arnold) نے اسلامی رواداری کا ذکر کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ حرف آخر ہے۔ وہ لکھتا ہے:

".........on the whole, unbeleivers have injoyed under Muhmmadan rule a measure of tolerance the like of which is not to be found in Europe untill quite modren time."

قلندر کا مطلب

عربی زبان میں اسے کلندر لکھا جاتا ہے جس کا مطلب ناتراشیدہ' یا دروازوں کے پٹ بند رکھنے کیلئے استعمال لکڑی کا ٹکڑا ہے۔ اس کا ایک مطلب غیر مہذب یا ناشائستہ آدمی ہے۔ وہ آدمی جو دین و دنیا سے آزاد ہو' مرد ناتراشیدہ و کرخت کو بھی قلندر کہا جاتا ہے۔ مولوی سید احمد دہلوی نے فرہنگ آصفیہ میں اس کے مطالب میں آزاد' بےنوا بھی لکھا ہے۔ مزید برآں برصغیر میں بندر اور ریچھ نچانے والے' بندر کے سوانگ کرنے والے مداری کو بھی قلندر کہا جاتا ہے۔ لغت کے اعتبار سے اس کا ایک مطلب خیمے کا آنکڑہ یا قلابہ ہے۔

فرہنگ آصفیہ کے مطابق جن اہل لغات نے اس لفظ کو قلندر یعنی نقطوں والے کاف سے لکھا ہے وہ اس بارے لکھتے ہیں کہ قلندر وہ شخص ہے جو دونوں جہاں سے پاک اور آزاد ہے۔ اسے اگر دنیا سے تھوڑی سی بھی رغبت ہو تو وہ مذہب قلندرِ سے دور اور صاحبان غرور میں شامل ہے کیونکہ قلندر اس ذات سے عبارت ہے کہ وہ نفوسِ واشکال عادتی بلکہ مال بے سعادتی سے بالکل مجرد و بےتعلق ہو جائے اور روح کے مرتبہ تک ترقی کر کے تکلیفات تمام دنیا سے سمیٹ لے۔ اور دست خواہش کو تمام خلائق سے کھینچ لے۔ یہاں تک کہ دل و جان سے سب سے قطع تعلق کر کے جمال جلال حق کا طالب اور اس کی درگاہ کا واصل ہو جائے چنانچہ قلندروں کا قول ہے:

عالم ہمہ بطائفہ صوفیاں پراست　　بسیار باشد از بجہاں یک قلندرے

مولوی سید احمد دہلوی بیان کرتے ہیں کہ قلندر، ملامتی اور صوفی میں یہ فرق ہے کہ قلندر نہایت آزاد اور مجرد عن العلائق ہوتا ہے۔ جہاں تک ممکن ہو وہ عادت وعبادت کی تخریب کی کوشش کرتا ہے۔ ملامتی عبادت کے چھپانے کی بہت کوشش کرتا ہے یعنی کوئی نیکی ظاہر نہیں کرتا اور کوئی بدی چھپاتا نہیں ہے۔ صوفی وہ ہے کہ اس کا دل بالکل مخلوق کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور نہ اسے ان کے ردوقبول کی کوئی پریشانی ہوتی ہے۔ صوفی کا مرتبہ سب سے زیادہ بلند ہے کیونکہ باوجود تجرید وتفرید وہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا پیرو اور ان کے قدم بہ قدم چلنے والا ہوتا ہے۔ ہر لمحہ تجدد و وحدت کی کوشش کرتا ہے اور نعرۂ ھل من مزید لگاتا ہے۔

لغوی مفہوم کے بعد مختلف مسالک کے علماء و بزرگان قلندر کی اصطلاح کو جن معانی میں بیان کرتے ہیں آیئے ان سے آگاہی پائیں۔

مولانا اشرف علی تھانوی صاحب اپنی کتاب معرفتِ الٰہیہ میں لکھتے ہیں:

''رہ قلندر ایک خاص اصطلاح ہے قلندر یہ طبقہ اولیاء اللہ میں سے ہوتا ہے جو ایک خاص مذاق اور ایک خاص رنگ نسبت سے شرف حاصل ہوتا ہے۔ جن اولیاء اللہ کو ہر وقت حق تعالیٰ شانہ کے ساتھ ایک خاص کیفیت استحضاری نصیب ہو جاتی ہے اور ان کے سر پر ہر وقت نسبت کا گویا ایک پہاڑ رکھا ہوتا ہے۔ ایسے حضرات تکثیر نوافل اور تکثیر وظائف میں مشغول نظر نہیں آتے ہیں لیکن ان کے باطن پر کسی وقت غفلت اور ذہول نہیں طاری ہوتا ہے۔ یہ حضرات تکثیر اوراد اور وظائف سے زیادہ اس امر کا اہتمام رکھتے ہیں کہ قلب ایک لمحہ کو بھی حق تعالیٰ شانہ سے غافل نہ ہو۔ اسی مذاق کا نام مذاق قلندری ہے۔''

مرشد پاک حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری قلندرانہ کیفیت اور حال کو سکر کا نام دیتے ہیں۔ آپ کشف المحجوب میں لکھتے ہیں:

''ارباب معانی سکر کا لفظ ''غلبہ محبت حق تعالیٰ'' کیلئے استعمال کرتے ہیں اور صحو ''حصول مراد'' کیلئے''۔ سکر بارے مختلف اولیاء کرام کے بیان کردہ مطالب کو آپ یوں رقم کرتے ہیں:

''ابو یزید اور اس کے پیروکار سکر کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں صحو کی بنیاد آدمیت کی صفت کے استحکام و استقامت پر ہوتی ہے اور آدمیت کی صفت حجاب اعظم ہے۔ اس کے برعکس سکر صفات بشریت کے زوال اور ضیاع پر مبنی ہوتا ہے۔''

حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ''انسانی تدبر' اختیار' تصرف اور خودی کی فنا ہو تو سکر (قلندری) ظاہر ہوتی ہے اور صرف وہ قوتیں باقی رہ جاتی ہیں جو بشریت سے بالاتر ہوں یہی قوتیں کامل اور مکمل ترین ہوتی ہیں۔'' آپ لکھتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام حالت صحو میں تھے جو فعل ان سے ظہور پذیر ہوا اللہ تعالیٰ نے اسے ان کی ذات سے منسوب کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کر دیا'' یعنی وہ فعل داؤد علیہ السلام سے منسوب قرار دے دیا جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عالم سکر میں تھے جو چیز ان سے ظہور پذیر ہوئی۔ باری تعالیٰ نے اسے اپنی طرف منسوب کیا اور فرمایا ''جب پھینکیں (کنکریاں) تو نے نہیں پھینکیں بلکہ اللہ نے پھینکیں''

ابو یزید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ بندے' بندے میں کتنا فرق ہے جو اپنی ذات میں قائم اور اپنی صفات میں ثابت تھا۔ بوجہ کرامت اس کا فعل اسی سے منسوب کیا جو ذات حق سے قائم اور اپنی صفات میں فانی تھا۔ اس کا فعل اپنا گردانا' انسانی فعل کا ذات حق سے منسوب ہونا اس سے بہتر ہے کہ فعل حق تعالیٰ بندے سے منسوب ہو۔ جب فعل حق بندے سے منسوب ہو تو بندہ صفات بشریت میں قائم ہوتا ہے اور جب بندے کا فعل حق سے منسوب ہو تو بندہ ذات حق سے قائم ہوتا ہے۔

حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ صحو کو سکر پر ترجیح دیتے ہیں ان کے نزدیک سکر

محل آفت ہے کیونکہ اس کا مطلب پریشان حالی، فنائے صحت اور از خود رفتگی ہے۔ طالب کی طلب از روئے فنا ہوتی ہے یا از روئے بقا۔ از روئے محویت ہوتی ہے یا از روئے ثبات۔ جب انسان صحیح الحال نہ ہوتو تحقیق وطلب بے کار ہے۔ اہل حق کا دل تمام موجودات سے مجرد ہونا چاہیئے۔ حضرت جنید بغدادی کی رائے میں جو لوگ عالم اشیاء کی دلفریبیوں میں الجھ جاتے ہیں وہ دراصل کسی چیز کو اس کے اصلی رنگ میں نہیں دیکھتے اگر دیکھتے تو الجھنے سے محفوظ رہتے۔ فنا کی نظر ہو تو حق تعالیٰ کے سوا ہر چیز فانی نظر آتی ہے۔ بہر صورت وہ کائنات سے روگرداں ہو جاتا ہے۔ اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا میں فرمایا کہ ''اللھم ارنا الاشیاء کما ھی'' یعنی اے اللہ ہمیں ہر چیز اس کے اصل روپ میں دکھا۔ یہ معانی ہے باری تعالیٰ کے اس فرمان کے فاعتبروا یا اولی الابصار ''اے آنکھ والو عبرت حاصل کرو'' یہ تمام بجز صحو سرانجام نہیں پا سکتا۔ اہل سکر اس سے قطعاً محروم ہیں۔ حضرت جنید بغدادی ابو یزید رضی اللہ عنہ کے دلائل کے جواب میں کہتے ہیں کہ موسیٰ رضی اللہ عنہ حالت سکر میں تھے ایک تجلی کی تاب نہ لا سکے بے ہوش ہو گئے۔ ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حالت صحو میں تھے۔ مکہ سے قاب قوسین تک تجلیوں کی زد میں ہوشیار و بیدار تر رہے۔

داتا گنج بخش علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے مرشد ابوالفضل محمد الختلی فرماتے ہیں کہ ''سکر بازیچہ اطفال ہے اور صحو رزم گاہ مرداں'' سید علی ہجویری اپنی رائے یوں بیان فرماتے ہیں۔

''سکر دراصل اپنی ذات کی فنا کا غلط احساس ہوتا ہے۔ حالانکہ صفات بشریت موجود ہوتی ہیں۔ یہ ایک حجاب ہے اس کے برعکس صحو دیدار بقا ہوتا ہے جہاں صفات بشریت ختم ہو چکتی ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ سراسر غلط ہے کہ سکر فنا کے قریب تر ہے کیونکہ سکر صحو کی صفت پر ایک زائد صفت ہے۔ سکر کی دو اقسام ہیں۔

(۱) سکر از راہ مودت　　　(۲) سکر از راہ محبت

پہلی قسم کا سکر نعمت کے پیش نظر ظہور پذیر ہوتا ہے۔ دوسری قسم کے سکر کیلیے علت کی ضرورت نہیں وہ منعم کے التفات سے پیدا ہوتا ہے۔ نعمت پر نظر رکھنے والا ذاتی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے مگر منعم کو سامنے رکھنے والا منعم میں محو ہوتا ہے اور اپنی ذات کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ گویا وہ صاحب سکر ہو کر بھی صاحب صحو ہوتا ہے۔

حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی فتوح الغیب میں رقم طراز ہیں کہ ''جب تک تو مخلوق سے علیحدگی اختیار نہ کر لے' تمام حالات میں اپنا دل ان سے نہ پھیر لے اور تیری ذاتی خواہش وارادہ علیحدگی اختیار نہ کر لے' تمام حالات میں اپنا دل ان سے نہ پھیر لے اور تیری ذاتی خواہش وارادہ ختم نہ ہو جائے اور دنیا و آخرت میں اپنی ہستی کو نیستی میں تبدیل نہ کر دے اور تیرا قلب ایسا پاکیزہ اور صاف شیشہ نہ بن جائے جس میں ارادہ الٰہی کے علاوہ کچھ ہے ہی نہیں۔ اس وقت تک اپنے چہرے سے نقاب و پردہ نہ ہٹا۔''

عربی روایت سے جڑے ہوئے اولیاء کرام قلندر کی موجودہ معانی میں استعمال اصطلاح سے لاتعلق ہیں بلکہ فارسی اور دیگر غیر عرب روایات میں بھی یہ اصطلاح ان معانی میں بہت بعد میں رائج ہوئی۔ ایران میں صوفیاء کے بجائے صرف آزاد طبیعت مردوں کو ہی قلندر کہا جاتا رہا ہے۔ ہمارے ہاں جو ڈھائی قلندر کا تصور ہے وہ سراسر غلط ہے۔ حضرت عثمان مروندی المعروف شہباز قلندر اور حضرت شرف الدین بوعلی قلندر ایک ہی دور میں پیدا ہوئے۔ حضرت رابعہ بصری' زہد و عبادت کے بہت بلند درجہ پر فائز تھیں اس کے علاوہ برصغیر میں قلندری طریقہ بھی موجود ہے۔ خود حضرت لعل شہباز قلندر بابا ابراہیم سے اس طریقے میں بیعت تھے لہٰذا صرف حضرت بوعلی قلندر' حضرت شہباز قلندر اور حضرت رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا کو قلندر قرار دینا باقی قلندروں کے وجود سے انکار ہے جو کسی طور بھی مناسب بات نہیں۔ صوفیاء میں کسی ولی کے مقام کے انکار کو بہت بڑی آفت قرار دیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا تمام بحث سے ہمارے سامنے قلندر کی جو شخصیت نمودار ہوتی ہے اسے

ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے:

"قلندر ایک ایسا آزاد مرد خود آگاہ ہے جس کے پاؤں میں نہ تو کسی دنیاوی مال کی محبت نے بیڑیاں ڈالی ہوتی ہیں اور نہ ہی وہ خدا کے علاوہ کسی سے ڈرتا ہے۔ کوئی بادشاہ کوئی جابر سے جابر مخلوق کوئی بڑی سے بڑی آفت اور مصیبت اسے ذرا بھی متفکر نہیں کرتی۔ کوئی خوبصورت سے خوبصورت منظر جمالِ یار سے زیادہ دلکش نہیں ہوتا۔ غرض دنیا میں رہتے ہوئے اس کی چیزیں دیکھتے ہوئے یہاں کی آوازیں سنتے ہوئے بھی وہ نہ کچھ دیکھ رہا ہوتا ہے نہ سن رہا ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت میں جلال کا غلبہ ہوتا ہے۔ فرائض کے علاوہ اس کی عبادات زیادہ تر خفی ہوتی ہیں۔ قلندر کی حالت کسی قدر ملامتی بھی ہوتی ہے۔"

قلندروں کے دنیا سے قطع تعلق اور کسی قدر ملامتی طرز فکر کے باعث کچھ خام عقیدہ اور بہروپیے بھی خود کو ملنگ اور قلندر قرار دیتے نظر آتے ہیں۔ قلندر نشہ حق سے مخمور ہوتے ہیں جس کے باعث ان کی حالت اکثر اہل دنیا کے موجب نہیں ہوتی جبکہ بہروپ بھرنے والے مختلف نشہ آور اشیاء استعمال کر کے اس حال کا سوانگ بھرتے ہیں۔ بھنگ اور چرس پی کر مدہوشی کی کیفیت میں نعرے لگانا اور گالم گلوچ کرنا باعث حجاب ہے۔ نشہ حق سے مخمور دنیا کیلئے مدہوش مگر بارگاہ حق میں حاضر باش اور چوکس ہوتا ہے لیکن یہ سوانگ رچانے والے یہاں سے بھی محروم اور دربار حق سے بھی محروم اور مدہوش و غافل کا نام پاتے ہیں۔

سید عثمان مروندی رحمۃ اللہ علیہ کے آباؤ اجداد

حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ

آپ کا اسم مبارک جعفر' کنیت ابو عبداللہ اور لقب صادق تھا۔ آپ حضرت امام محمد باقر کے فرزند ارجمند' حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کے پوتے اور شہید کربلا امام حسین رضی اللہ عنہ کے پڑپوتے تھے۔ آپ کی والدہ ام فروہ قاسم بن محمد کی دختر نیک اختر اور محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کی پوتی تھیں۔ قاسم کا شمار مدینہ کے سات فقہا میں ہوتا ہے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۷ ربیع الاول ۸۳ھ کو مدینہ منورہ میں ہوئی۔ اس وقت آپ کے دادا حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ بقید حیات تھے۔ آپ کے والد بزرگوار امام محمد باقر کی عمر ۲۶ سال تھی۔ گھر میں اس مبارک پیدائش پر انتہائی مسرت وشادمانی کا اظہار کیا گیا۔

آپ بارہ برس کی عمر تک اپنے دادا حضرت زین العابدین کے زیر سایہ تعلیم حاصل کرتے رہے اور ان کی رحلت کے بعد انیس برس تک اپنے والد ماجد امام محمد باقر سے تعلیم وتربیت حاصل کرتے رہے۔

شہادت امام حسین رضی اللہ عنہ کے بعد برابر ۳۵ برس تک امام زین العابدین کا مشغلہ سوائے عبادت کے اور کچھ نہ تھا۔ اس وقت واقعہ کربلا کو بائیس برس ہو چکے تھے لیکن تادم حیات وہ اپنے اثر کی وجہ سے ابھی کل ہی کی بات لگتی تھی۔ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے جب آنکھ کھولی تو اسی فضا میں شب و روز شہادت حسین رضی اللہ

عنہ کے ذکر اور ان کے غم نے ان کے دل و دماغ پر وہ اثر قائم کیا جیسے کہ وہ خود میدان کربلا میں موجود تھے۔

اس دور میں سیاستِ بنوامیہ کی بنیادیں لرز رہی تھیں اور خلق خدا امام محمد باقر کے علمی فیض سے بہرہ ور ہونے کی خاطر ان کی طرف رجوع کر رہی تھی اور طالبان علم آپ کے درس میں شرکت کر کے فیض یاب ہو رہے تھے۔ امام جعفر صادق کے علاوہ اس دور میں بڑے بڑے فقیہ محدث حضرات اور اکابر علماء اسی درس گاہ سے اکتساب علم کرتے تھے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی امام باقر کے درس میں سالہا سال شرکت فرمائی۔

۱۱۴ھ میں حضرت امام محمد باقر نے وفات پائی۔

۱۲۰ھ میں خلیفہ شام کی فوجوں نے آپ کے چچا حضرت زید بن امام زین العابدین کو انتہائی بے دردی سے شہید کر کے ان کی لاش کو کوفہ کے شاہی دروازہ پر لٹکا دیا جو برسوں تک لٹکی رہی۔ حضرت زید کی شہادت کے ایک سال بعد ان کے بیٹے یحیٰی کو بھی شہید کر دیا گیا۔ ایسے صدمات کو بھی وہ انتہائی صبر و تحمل سے برداشت کرتے رہے۔ دین کی نشر و اشاعت کو برابر جاری رکھا۔

بنوامیہ کا آخری دور فسادات اور سیاسی کشمکش کا مرکز بن چکا تھا۔ حکومتیں تیزی سے تبدیل ہو رہی تھیں۔ جیسا کہ ہشام بن عبدالملک کے بعد ولید بن یزید بن عبدالملک اس کے بعد یزید بن ولید بن عبدالملک اس کے بعد ابراہیم بن ولید بن عبدالملک اور اس کے بعد مروان جس پر بنوامیہ کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ دوسری طرف بنوعباس نے امام حسین رضی اللہ عنہ کے انتقام لینے کے نام پر خلق خدا کو اپنی طرف متوجہ کرنے، بنوامیہ کی جڑیں اکھیڑنے اور بنوفاطمہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس طرح وہ امام جعفر صادق کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں کسی حد تک کامیاب رہے۔ اس طرح بنوعباس کے دور حکومت کا آغاز ہوا لیکن جیسا کہ اوپر بیان

کیا جا چکا ہے کہ بنو عباس کا نعرہ جنگ ہی یہ تھا کہ ہم بنو فاطمہ کا انتقام لے رہے ہیں اور حکومت کی باگ ڈور انہی کو سونپی جائے گی اس لئے ان کو یہ خدشہ پیدا ہوا کہ کل کوئی ایسی تحریک پیدا نہ ہو جو ہم سے یہ مطالبہ کرے کہ حسب وعدہ اب حکومت بنو فاطمہ کو سونپ دو اس لئے وہ بنو فاطمہ اور ان کے طرفداروں پر ہمیشہ کڑی نظر رکھتے رہے۔

ایسے حالات کے باوجود بھی امام جعفر صادق خاموشی سے دین کی نشر و اشاعت میں مشغول رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ جو آپ کی امامت کو تسلیم کرتے تھے آپ کی عظمت کو قبول کرتے ہوئے فخریہ آپ کے حلقہ درس میں شامل ہونے لگے۔

مہمان نوازی، خیر و خیرات، مخفی طور پر غربا کی خبر گیری، عزیز و اقارب سے حسن سلوک، خطائیں معاف کرنا اور صبر و تحمل ان کے خاص خصائل تھے۔ آپ رؤسا سے زیادہ غریبوں کی عزت اور مزدوروں کی قدر کرتے وہ خود بھی محنت کرتے تھے اور اکثر اپنے باغ میں کام کرتے نظر آتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ حسب معمول بیلچہ ہاتھ میں لئے باغ میں کام کر رہے تھے اور پسینے میں شرابور تھے تو کسی شخص نے آپ کو اس حالت میں دیکھ کر کہا کہ آپ بیلچہ مجھے دے دیں تا کہ یہ خدمت میں بجا لاؤں لیکن آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ حصول معاش میں دھوپ اور گرمی کی تکلیف برداشت کرنا کوئی عیب نہیں ہے۔

آپ کی علمی جلالت کی شہرت کے باعث لوگ دور دور سے چل کر حصول علم کی خاطر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد چار ہزار سے بھی تجاوز کر چکی تھی۔ ان میں فقہا کے علاوہ متکلمین بھی شامل تھے۔ فقہ کے علاوہ آپ نے علم ریاضی اور علم کیمیا کی تعلیم بھی بہت سے شاگردوں کو دی تھی۔ ان میں سے جابر بن حیان علم کیمیا اور علم ریاضی کے امام فن گزرے ہیں جس نے ان فنون پر صدہا رسائل لکھے ہیں اور اس کی شہرت کے ڈنکے آج تک یورپ میں بج رہے ہیں۔ ان شاگردوں میں وہ اکابرین بھی شامل تھے جنہوں نے فقہی مسائل پر صدہا تصانیف چھوڑی ہیں۔

خلیفہ منصور کو آپ کی مقبولیت سے خدشہ ہوا کہ کہیں آپ اقتدار پر حق کا دعویٰ نہ کر دیں لیکن چونکہ امام جعفر صادق کی زندگی کا کوئی بھی ایسا عمل نہیں تھا جس کو جواز بنا کر حکومت اعلانیہ ان کے خلاف کوئی اقدام کرتی یا کشت و خون سے انہیں شہید کرواتی لہٰذا مخفی طور پر زہر دلوا کر امام کو شہید کرایا گیا۔ اس وقت آپ کی عمر ۶۵ برس تھی۔ آپ نے ۱۵ شوال ۱۴۸ھ کو مدینہ منورہ میں جام شہادت نوش فرمایا۔ تجہیز و تکفین کے فرائض آپ کے فرزند ارجمند امام موسیٰ کاظم بجالائے اور انہیں بھی جنت البقیع کے اس احاطے میں سپرد خاک کیا گیا جہاں ان کے اجداد امام حسنؑ امام زین العابدین اور امام محمد باقر پہلے ہی مدفون تھے۔

امام جعفر صادق کے آٹھ فرزند تھے۔ جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

سید اسماعیل عرج اکبر، امام موسیٰ کاظم، عبداللہ، اسحاق، محمد، عباس، یحییٰ اور علی۔

حضرت اسماعیل عرج اکبر

تاریخ گلزار شمس میں اس طرح تحریر ہے کہ سید اسماعیل کا شجرہ نسب سید آغا سلطان کے پاس تحریر شدہ ہے۔ جناب سید اسماعیل بن حضرت امام جعفر صادق کو جو لوگ امام جعفر صادق کا وارث یا ان کے بعد امام تسلیم کرتے ہیں وہ شیعہ اسماعیلی کہلائے جاتے ہیں۔ ان کی ولادت ۱۰۰ھ میں اور وفات ۱۴۷ھ میں ہوئی تھی۔ تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت اسماعیل اپنے والد ماجد کی زندگی میں ہی وفات پا چکے تھے لیکن اسماعیلی کہتے ہیں کہ وہ امامت پر مقرر ہوئے تھے۔

سید محمد عریض بن سید اسماعیل عرج اکبر

سید اسماعیل کے دو فرزند تھے جن میں سے بڑے بیٹے کا نام محمد عریض تھا۔

آپ کی ولادت باسعادت ۱۲ ربیع الاول ۱۲۸ھ عریض میں ہوئی۔ عریض مدینہ منورہ سے تقریباً ۸ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ فرشتہ محمد قاسم اپنی تاریخ میں یوں رقم

طراز ہیں کہ محمد بن اسماعیل امام جعفر صادق کی زندگی میں ہی ملک رے کی طرف چلے گئے تھے۔ وہاں محمد آباد نامی شہران ہی کے نام سے منسوب ہے۔

جلیل سیہوانی نقل کرتے ہیں کہ خلیفہ ہارون الرشید نے جو اس وقت دور عباسیہ کا تاجدار تھا' اپنے وزیر یحییٰ برمکی سے مشورہ کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ اولاد ابو طالب میں سے کسی کو آگے کر کے حضرت امام موسیٰ کاظم کے اثر ونفوذ کو کم کروں نیز ان کی مصروفیات کے متعلق معلومات بھی حاصل ہو جائیں۔

اس سلسلے میں اس نے محمد بن اسماعیل کا نام پیش کیا اس پر ہارون الرشید نے محمد بن اسماعیل کو ایک خط روانہ کیا محمد بن اسماعیل نے حاکم الوقت کے خط کو اپنی دنیاوی کامیابی کا بہترین ذریعہ سمجھ کر فوراً بغداد جانے کا ارادہ کیا چونکہ سفر کے اخراجات کیلئے اس کے پاس کچھ نہیں تھا لہٰذا انتہائی مجبوری کے عالم میں اس نے امام موسیٰ کاظم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے بغداد جانے کا مقصد ان پر ظاہر کیا۔ امام موسیٰ کاظم نے حجت پوری کرنے کی خاطر فرمایا کہ آپ یہیں قیام کریں میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں نہ صرف آپ کے قرض وغیرہ کی ادائیگی کر دوں گا بلکہ حتی الامکان آپ کی ضروریات زندگی کو بھی پورا کرتا رہوں گا۔ لیکن محمد نے اپنا ارادہ ملتوی نہ کیا اور حضرت سے رخصت چاہنے لگے اور کہنے لگے۔ وہاں کیلئے آپ مجھے کچھ ضروری ہدایات دیں۔

پہلے تو امام خاموش رہے لیکن جب محمد نے اپنے انہی الفاظ کو دو تین مرتبہ دہرایا تو آپ نے فرمایا کہ محمد اس بات کا خیال رکھنا کہ ایسا نہ ہو کہ تم بھی میرے خون میں شریک کئے جاؤ۔ اس پر محمد نے کہا کہ ایسی کیا بات ہے آپ مجھے اور کوئی ہدایت دیں۔ حضرت موسیٰ کاظم نے اس سفر کے اخراجات کیلئے اسے چار سو دینار اور پندرہ سو درہم عطا کئے لیکن نتیجہ وہی نکلا جو آپ کے پیش نظر تھا۔ محمد بن اسماعیل بغداد پہنچ کر یحییٰ برمکی کا مہمان ہوا اور اس کے ساتھ ہارون الرشید کے دربار میں حاضر ہوا جہاں اس کی خوب تعظیم و تکریم کی گئی۔ گفتگو کے دوران ہارون الرشید اس سے مدینہ کے حالات معلوم کرتا رہا۔

محمد نے انتہائی غلط بیانی کی اور یوں کہنے لگا کہ میں نے آج تک نہ کبھی دیکھا ہے اور نہ سنا ہے کہ ایک ہی ملک میں دو بادشاہ ہوں۔

اس پر ہارون الرشید نے پوچھا کہ کیا مطلب؟

محمد نے کہا جس طرح آپ بغداد میں حکومت کر رہے ہیں بالکل اسی طرح موسیٰ کاظم نے مدینہ میں اپنی سلطنت قائم کر رکھی ہے۔ لوگوں کی طرف سے انہیں خراج مل رہا ہے اور وہ آپ کے مقابلے کے دعویدار ہیں۔ یہ سنتے ہی ہارون الرشید آگ بگولہ ہو گیا اور اسی وقت محمد کو دس ہزار دینار عطا کر کے رخصت کیا۔ اس کے بعد ہارون الرشید حج کے ارادہ سے مکہ شریف پہنچا اور وہیں سے فوج روانہ کر کے امام موسیٰ کاظم کو مدینہ منورہ سے گرفتار کرا لیا۔

جس وقت ہارون الرشید کی فوج امام موسیٰ کاظم کو گرفتار کرنے کیلئے پہنچی اس وقت آپ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہر میں عبادت الٰہی میں مشغول تھے۔

امام موسیٰ کاظم نے ہارون الرشید کے قید خانے میں زہر کے اثر سے ۱۵ رجب ۱۸۳ھ میں رحلت فرمائی۔ آپ کا مزار شریف بغداد کے قریب کاظمین شریف میں مرجع خلائق ہے جہاں انبوہ کثیر روزانہ زیارت کر کے فیض یاب ہوتا ہے۔ اسی بنا پر امام موسیٰ کاظم کا مرقد باب الحوائج مشہور ہے۔

روایات میں ہے کہ اس کے بعد محمد عریضی بن سید محمد اسماعیل عرج اکبر مع اہل و عیال "رے" کی طرف چلے گئے اور وہیں محمد آباد شہر میں اقامت پذیر ہوئے جو ان ہی کے نام سے موسوم ہے۔ ان کی اولاد زیادہ تھی جو خراسان، قندھار، مروند اور سندھ جا کر آباد ہوئے۔ ان کے چھ فرزند تھے۔ جن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ سید شہزادہ احمد۔ جس کی اولاد مصر و افریقہ کی حکمراں ہوئی اور خود کو فاطمی امام کہلاتی تھی۔

۲۔ سید اسماعیل ثانی۔ لقب امام الدین

۳۔ سید جعفر شاعر۔

۴-سید عیسیٰ اکبر۔

۵-سید زید۔

٦-سید علی عارف۔

چونکہ قلندر شہباز کا سلسلہ نسب حضرت اسماعیل ثانی سے ملتا ہے اس لئے صرف انہی کا سلسلہ پیش کیا جاتا ہے۔

سید اسماعیل ثانی بن محمد عریضی

سید اسماعیل ثانی کی ولادت باسعادت ١٢ ربیع الاول ١٥١ھ میں محمد آباد میں ہوئی۔ آپ نے ٥١ سال کی عمر میں ٢٠٢ھ میں رحلت فرمائی۔ آپ کا مزار شریف محمد آباد میں ہے آپ کے سات فرزند تھے جن میں سے بڑے فرزند کا اسم شریف سید محمد منصور تھا۔

سید محمد منصور بن اسماعیل ثانی

ملفوظات کمالیہ میں سید کمال الدین' موج دریا تحریر فرماتے ہیں کہ آپ کی ولادت ١٥ شعبان بروز شنبہ ١٧٢ھ میں محمد آباد میں ہوئی۔ آپ جلیل القدر بزرگ' علوم ظاہر و باطن کے عالم فاضل اور سخی تھے۔ آپ کی وفات ٢٣٤ھ میں محمد آباد میں ہوئی۔ آپ کے پانچ فرزند تھے جن میں سے بڑے کا نام سید غالب علی المعروف غالب الدین تھا۔

سید غالب الدین بن سید محمد منصور

آپ کی ولادت ٢١ صفر ٢٢٠ھ کو ہوئی آپ مع اہل وعیال اور عزیز و اقارب سید عبداللہ کے ساتھ مصر میں جا کر قیام پذیر ہوئے۔ آپ کی وفات ماہ شوال ٢٧٥ھ میں ہوئی۔ آپ کے چار فرزند تھے۔ ان میں سے قلندر لعل شہباز کے سلسلے والے بزرگ کا اسم گرامی سید عبدالمجید تھا۔

سید عبدالمجید بن غالب الدین

آپ کی ولادت باسعادت ۱۵ شعبان بروز جمعہ ۲۹۰ھ محمد آباد میں اور وفات ۱۵ ذوالقعدہ ۳۸۷ھ کو شہر طین میں ہوئی۔ آپ کے دو فرزند جلیل القدر گزرے۔

۱۔سید منتخب۔ ۲۔سید منتظر۔

سید عبدالمجید کے متذکرہ دونوں بیٹوں کی اولاد میں بہت سے بزرگ اور اہل اللہ ہو گزرے ہیں۔ جیسا کہ حضرت منتظر باللہ کی اولاد میں سے شاہ شمس الدین تبریز جیسے ولی اللہ اور منتخب باللہ کی پشت سے حضرت قلندر شہباز جیسے گوہر ظہور میں آئے۔

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ محمد عریضی کے فرزند شہزادہ احمد کے خاندان نے مصر اور افریقہ پر اپنی بادشاہت قائم کی جو فاطمی حکومت کے نام سے مشہور ہے۔ شہزادہ احمد کے خاندان نے بادشاہت کے زور پر اپنی امامت بھی تسلیم کروائی تھی۔ انہوں نے اپنی حکومت میں اپنے نام کا خطبہ رائج کیا اور خود کو اسماعیلی گروہ کے پشت در پشت امام کہلواتے رہے۔ اس وقت ان کے انچاسویں امام کریم آغا خاں ہیں۔ دوسری طرف محمد عریضی کے دوسرے فرزند سید اسماعیل ثانی اور اس کی اولاد نے دین کی تبلیغ و تشہیر کی۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ محمد عریضی کے ایک فرزند نے تو دنیاوی حکومت کو اپنایا لیکن دوسرے فرزند اور ان کی اولاد نے پشت در پشت اپنے آباؤ اجداد کے طریقہ کی تبلیغ کی اور امام جعفر صادق، امام موسیٰ کاظم اور امام موسیٰ رضا کی امامت کو حقیقی تسلیم کرتے ہوئے اپنے حال وقال ان کی متابعت میں دے کر عمل کرتے رہے۔ ان میں سے بہت سے غوث، قطب اور اولیاء ہو گزرے ہیں۔ حضرت شمس تبریز بھی ان میں سے ایک ہیں۔ آپ کا شجرہ نسب حضرت منتظر باللہ سے اس طرح ملتا ہے۔

حضرت سید پیر شاہ شمس الحق تبریزی بن سید صلاح الدین محمد نور بخش بن علی اسلام الدین بن سید عبدالمومن (بادشاہ افریقہ) بن سید علی خالد الدین بن سید محمد محب الدین سید السادات علی درجات امیر الامراء شمشیر زن سید محمود سبزواری (مدفون لاہور) بن سید

محمد بن سید ہاشم علی بن سید احمد ہادی بن سید منتظر باللہ۔ تاریخ گلزار شمس میں اس طرح تحریر ہے کہ حضرت شمس تبریز کے والد ماجد سید صلاح الدین کا رہنا سہنا ہمیشہ درویشانہ طرز کا تھا۔ آپ اپنے جد امجد اسماعیل کو امام نہیں تسلیم کرتے تھے۔ آپ کا طریقہ صوفیانہ تھا۔ آپ کے لاتعداد مرید تھے اور آپ حق کے داعی تھے۔ آپ سبزوار میں رہتے تھے۔ ۵۶۰ھ میں خدا تعالیٰ نے آپ کو وہ فرزند ارجمند عطا کیا جو شاہ شمس الحق تبریزی کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ وہ عالی مرتبہ اور صاحب کرامت ہو گزرے ہیں۔ وہ بھی اپنے والد ماجد کے ساتھ دین کی تبلیغ میں مصروف رہے۔ آپ نے اپنے والد کے ساتھ کشمیر اور تبت تک کا سفر کیا۔ کتابوں میں تحریر ہے کہ تبت میں آپ کو شمس الدین کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ جب آپ نے تبریز میں زیادہ عرصہ تک قیام کیا تو آپ شمس الدین تبریزی کے اسم گرامی سے موسوم ہوئے۔ شہر قونیہ میں آپ کو شمس پرندہ کہا جاتا تھا۔ شام و مصر میں آپ شمس مغربی کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ شاہ قاسم انوار بھی آپ کا خطاب تھا۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مختلف ناموں والے مختلف شمس ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہے یہ وہی شمس الدین ہیں جن کا مزار قونیہ ترکی میں ہے۔ حضرت شمس تبریز ولی اللہ اور زبردست شاعر تھے۔

حضرت شمس تبریز ان اہل اللہ مجاہدوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے دین کی تبلیغ کی خاطر بہت سے سفر اختیار کئے اور ایک مرتبہ اپنے والد ماجد سے اجازت لے کر حج کے ارادے سے مکہ معظّمہ اور اس کے بعد مدینہ منورہ، بصرہ، بغداد، دمشق اور مصر گئے۔ آپ ہر جگہ بغیر کسی خوف و خطر کے اپنے نظریے کی تبلیغ کرتے رہے۔

آپ نے ایک جگہ فرمایا:

شمس الدین تبریز گرفت مصر و شام و بصرہ و بغداد را۔

آپ بہت کرامات دکھا کر خود کو راہ حق پر ثابت و متمکن کر کے عوام کو راہ حق کی ہدایت کرتے رہتے تھے۔

حضرت شمس تبریز کا سال وفات ۶۷۵ھ ہے۔ قونیہ ترکی میں آپ کا مزار شریف ایک مشہور زیارت گاہ ہے۔ آپ کا فیض ہنوز جاری ہے۔ آپ کے روضہ پر یہ شعر نقش ہیں:

حکم بنائے روضہ شد از درگاہ لم یزل
گشت ارشاد پہ چہار نگاہ درویشاں ولی
بود زلف ماتعین احد ہجری!
کہ کرد بسم اللہ تاریخ منت موجودے
تعمیر خانقاہش روضہ دریافت جلی
حمہ مولوی در عہد حیات میر صفدر علی
یک ہزار یک صد نو وچہار ہجری
کہ بڑ درشد ایں نامہ ابیات قلندری

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے روضہ مبارک کی تعمیر کا حکم ہوا۔ یہ حکم ولیوں، درویشوں کی عظمت و رفعت کے باعث جاری کیا گیا۔ سن ایک ہجری کو یہ واقعہ رونما ہوا اس کا آغاز بسم اللہ سے کیا گیا۔ آپ کے مزار اقدس کی تعمیر میر صفدر علی کی زندگی میں ہوئی۔ یہ قلندری اشعار ایک ہزار ایک سو نو ہجری میں تحریر کیے گئے۔

حضرت شمس تبریز کی اولاد میں سے سید حسن کبیر کفر شکن (مدفون اچ شریف) اور ان کی اولاد پیر امام الدین (مدفون پیرانہ احمد آباد گجرات) جلیل القدر اولیاء اللہ ہو گزرے ہیں۔

آپ کی تبلیغ و ہدایت سے ہزار ہا ہندو مسلمان ہوئے۔

سید محمد منتخب باللہ بن سید عبدالمجید

آپ اپنے والد کے بڑے بیٹے تھے۔ آپ کی ولادت ۳۱۵ھ میں ہوئی۔ آپ آذربائیجان کی طرف مروند میں جا کر آباد ہوئے اور وہیں ۳۷۵ھ میں وفات پائی۔

آپ کے بڑے فرزند کا نام سید محمد مہدی تھا۔

سید محمد مہدی بن سید منتخب

آپ کی ولادت باسعادت ۳۴۵ھ میں مروند میں ہوئی۔ آپ بلند پائے کے ولی اللہ ہوگزرے ہیں۔ لوگ آپ کے معجزات وکرامات دیکھ کر آپ کو امام مہدی سمجھنے لگتے تھے لیکن آپ ان کو کہتے تھے کہ امام مہدی امام حسن عسکری کے فرزند ہیں جبکہ میں سید منتخب کا بیٹا ہوں۔

آپ کلام پاک کی یہ آیت پڑھتے۔ ال م ذالک الکتاب لا ریب فیہ ھدا اللمتقین الذین یومنون بالغیب (تحقیق یہ نازل کی ہوئی کتاب ہادی ہے ان متقیوں کیلئے جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔) آپ کی وفات ۱۵ شوال ۴۰۵ھ کو ہوئی۔

آپ کے بڑے فرزند کا نام سید ہادی تھا۔

سید ہادی بن سید مہدی

آپ کی ولادت ۹ شعبان ۳۷۲ھ کو مروند میں ہوئی۔ آپ صاحب ہدایت تھے۔ آپ اپنے والد بزرگوار کی مسابقت میں رہتے تھے۔ آپ کی وفات ۵ رجب ۴۳۴ھ میں ہوئی۔ آپ کے فرزند کا نام سید احمد تھا۔

سید احمد بن سید ہادی

آپ کی ولادت ماہ رمضان المبارک ۳۹۸ھ کو مروند میں ہوئی۔ آپ ظاہری و باطنی علوم کے مالک تھے۔ آپ کی وفات ۴۶۵ھ میں ہوئی۔ آپ کے چار فرزند تھے جن میں سے ایک، جن سے حضرت قلندر شہباز کا شجرہ نسب ملتا ہے، ان کا نام حضرت سید محمود تھا۔

سید محمود بن سید احمد

آپ کی ولادت ماہ ذی القعد ۴۲۲ھ میں اور وفات ماہ صفر ۴۸۱ھ میں ہوئی۔

آپ کے بڑے فرزند کا نام سید نور شاہ تھا۔

سید نور شاہ بن سید محمود

آپ کی ولادت ماہ شوال ۴۵۰ھ میں اور وفات ۵۲۰ھ میں ہوئی۔ آپ کی پیشانی نورانی تھی۔ آپ زیادہ تر عبادت الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ آپ کے معجزات وکرامات بے اندازہ ہیں۔

سید شمس الدین بن سید نور شاہ

آپ کی ولادت ماہ صفر ۴۷۳ھ مروند میں ہوئی اور وہیں ۵۳۷ھ میں وفات پائی۔ آپ کا مرقد مبارک بھی وہیں ہے۔ آپ کے بھائی سید سلطان شاہ مروند کے فرمانروا تھے۔ اس کے باوجود بھی آپ کسی قسم کا ناز یا غرور نہیں رکھتے تھے بلکہ درویشوں کی طرح انتہائی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ آپ کے ایک ہی فرزند سید ابراہیم کبیر الدین تھے جو انتہائی روشن ضمیر بزرگ ہو گزرے ہیں۔

شہباز قلندر کے والدین

سید عثمان مروندی المعروف لعل شہباز قلندر کی والدہ حاکم مروند سید سلطان شاہ کی دختر تھیں۔ آپ بڑی نیک اور عبادت گزار خاتون تھیں۔ طبیعت میں درویشی اور قناعت بے انتہا تھی۔ شوہر کے ساتھ کئی مقامات کے سفر کیے تاہم زیادہ وقت گھر میں ہی رہیں آپ کا مزار مروند شہر میں بتایا جاتا ہے۔

شہباز قلندر کے والد سید ابراہیم کبیر الدین بن شمس الدین کی ولادت ماہ جمادی الثانی ۵۰۱ھ کو مروند میں ہوئی۔

آپ کا اسم گرامی سید ابراہیم اور لقب کبیر الدین تھا۔ آپ مروند کے مشہور و معروف سادات میں سے تھے۔ آپ ہمیشہ مجردانہ زندگی کو پسند کرتے تھے اس لئے آپ شادی سے گریزاں تھے۔

آپ زیادہ عرصہ تک سیر و سیاحت میں مصروف رہے۔ ایک روایت میں ہے کہ شاہ ابراہیم جب سید الشہداء حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی زیارت کیلئے کربلائے معلیٰ گئے تو آپ کو ان کی طرف سے سلام کا جواب عنایت ہوا اور آپ کو وہ جگہیں بھی دکھائی گئیں جہاں شہدائے کربلا مدفون تھے۔ اس وقت جو زیارت کرنے والے آئے تھے وہ آپ سے وہ جگہیں معلوم کرکے وہاں ان شہداء کیلئے فاتحہ پڑھتے تھے۔

ایک دن امام حسین رضی اللہ عنہ کی طرف سے آپ کو یہ بشارت ہوئی کہ ہم آپ کو وہ ''باز'' دیتے ہیں جو ہمیں اپنا نانا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے بطورِ انعام عطا ہوا

تھا۔ بعد میں آپ کو قلندر لعل شہباز کی صورت میں ایک عالی المرتبت فرزند عطا ہوا۔

ایک دن سید ابراہیم کو اپنی پشت سے ندا آئی کہ آپ شادی کریں میں آپ سے ظہور میں آؤں گا۔ یہ آواز آپ کے فرزند قلندر لعل شہباز کی تھی۔ آپ نے جواب دیا کہ بہشت میں ظہور میں آنا افضل ہے اس پر قلندر شہباز نے جواب دیا کہ دنیا میں ظاہر ہونا احسن ہے۔

اس دن کے بعد سید ابراہیم نے شادی کی خواہش ظاہر کی۔ سید سلطان شاہ حاکم مروند نے آپ کو اپنی دختر نیک اختر کا رشتہ دیا اور شادی انتہائی دھوم دھام سے ہوئی۔ کتابوں میں مذکور ہے کہ سید کبیر الدین چالیس دن تک اپنی بیوی کے قریب نہیں گئے۔ اس عرصہ میں شادی کے جشن متواتر ہوتے رہے۔ جب سید ابراہیم سے اس کا سبب معلوم کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے شادی کے دن راہ چلتے ہوئے چنے کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا دیکھا، جس کو خدائی نعمت سمجھ کر میں نے اٹھا کر کھا لیا اور اسی ٹکڑے کا اثر برابر چالیس دن تک میرے جسم میں رہا۔ جب وہ اثر ختم ہوا تو میں اپنے گھر کی طرف راغب ہوا۔

آخر وہ مبارک گھڑی بھی آ پہنچی جب خدا تعالیٰ نے انہیں وہ فرزند عطا کیا جس کی پیشانی میں نور چمک رہا تھا۔ آپ بچپن ہی سے صاحب کرامت تھے۔ آپ جب کچھ بڑے ہوئے تو ہمیشہ سیر و سیاحت کے خیال سے گھر سے باہر رہتے تھے اور آپ کے والد ماجد سید ابراہیم آپ کے انتظار میں بے قرار رہتے تھے۔ اسی دوران آپ کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا۔ ان کی وفات سے سید ابراہیم کی درویشانہ طبع نے پلٹا کھایا اور وہ اپنے ابتدائی فقیرانہ خیالات پر محکم ہو کر کربلائے معلیٰ چلے گئے اور اپنے پرانے تکیہ کو دوبارہ آباد کر کے عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ ان کے فیض سے بہت سے طالب حق فیض یاب ہو کر حق کی تبلیغ کی خاطر دور دراز ممالک میں جا کر آباد ہوئے۔ امام عالی مقام کی مہربانی سے آپ کے فرزند وہیں آ کر آپ سے ملے۔ جن کی گود میں

آپ ۵۶۰ھ میں عازم دارالبقا ہوئے۔

آپ کربلائے معلیٰ میں مدفون بتائے جاتے ہیں۔ وہیں آپ کا مزار شریف' امام حسین کے روضہ اطہر میں' سید ابراہیم ''جوابی'' یا ابراہیم مجاب کے نام سے مشہور و معروف ہے۔

حضرت لعل شہباز قلندر

رحمۃ اللہ علیہ

ڈاکٹر عبدالمجید سندھی نے سید عثمان مروندی کے سات القاب بیان کیے ہیں۔

۱۔لعل ۲۔شہباز ۳۔سیف اللسان ۴۔قلندر ۵۔شمس الدین ۶۔مہدی ۷۔مخدوم

چونکہ عموماً لال رنگ کے کپڑے پہنے رہتے تھے اس لئے انہیں لعل کہا جاتا ہے۔

ان کے ایک دوست حضرت جلال بخاری بھی سرخ رنگ کے کپڑے پہنے رہتے تھے اور انہیں بھی مرشد نے ''سرخ'' خطاب عطا کیا تھا۔ مرشد سے سید عثمان کو خلافت ملی تو انہیں ''شہباز'' خطاب سے یاد کیا جانے لگا۔

''سیف اللسان'' کا لقب اس لئے حاصل ہوا کہ جو کچھ ارشاد فرماتے وہ پورا ہو جاتا تھا۔ مہدی کے کہنے کی وجہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کو یہ گمان ہوا تھا کہ شاید آپ مہدی آخرالزماں ہیں۔ اس ضمن میں مشہور عالم اور محدث نواب سید صدیق حسن اپنی کتاب ''منہج الکرامتہ فی آثار القیامہ'' میں رقمطراز ہیں کہ حضرت قلندر شہباز پر مہدی ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ ان کی عبارت اس طرح ہے:

گویم جماعتی درحق ایشاں گمان مہدیت رفت
دو گونہ اند یکی اولیائی صلحائی ست دیگر امرا

اہل حکومت اول سید محمد بخش و شیخ ادریس رومی و شاہ نعمت اللہ ولی شہباز قلندر و اتباع او قلندر بنام دارند ایں مردمی صالح بود۔

''قلندر'' کا لقب انہیں قلندری اختیار کرنے کی وجہ سے ملا۔

شمس الدین لقب انہیں تبلیغ اسلام کے صلہ میں ملا ہے۔علوم ظاہری اور علوم باطنی میں مہارت رکھنے کی وجہ سے ''مخدوم'' کہا جاتا ہے۔

تذکرۃ الانساب' معراج الولایت اور مرات الکونین میں ہے کہ حضرت غوث بہاءالدین ملتانی نے مرید کرنے پر انہیں ''قلندر شہباز'' کا لقب دیا تھا لیکن یہ بات غیر مصدقہ ہے۔

آپ کی ولادت باسعادت ماہ رجب ۵۳۸ھ میں مروند میں ہوئی۔تاریخ دان آپ کی ولادت کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

بجو تاریخ شمس الدین عثمان

نظر کن ریخ از فلک کرامت

۵۳۸

سن عمرش ولی اللہ وفاتش

۱۱۲

سرورش غیب می گوید بر رحمت

۶۵۰

اگر آپ شمس الدین عثمان کی تاریخ ولادت کو دیکھنا چاہیں تو کرامت کے ستاروں کو دیکھیں ۵۳۸

آپ کی وفات ۱۱۲ میں ہوئی اللہ تعالٰی کی طرف سے غیب سے آپ پر رحمت بھیجی گئی ۶۵۰

آپ جس ساعت سعید کو سید ابراہیم کبیر الدین کے ہاں متولد ہوئے اس وقت مروند کے شہر میں شاہانہ طور پر مسرت وشادمانی کی لہر دوڑ گئی اور شہر کے بہت سے معزز اشخاص ان کے والد کو مبارکباد پیش کرنے اور ایسے عظیم ولی اللہ کے دیدار کرنے کی نیت

سے آ کر جمع ہوئے جس نے اپنی پیدائش سے پہلے اپنے والد بزرگوار سے کلام کیا تھا۔ اس کے علاوہ ابراہیم کبیرالدین جو شادی کے معاملات سے متنفر تھے اس کے صاحب اولاد ہونے کی خبر نے لوگوں کو دیوانہ بنا دیا۔ مراد یہ ہے کہ جس طرح سید ابراہیم کی شادی کے موقع پر جشن ہوا تھا۔ ایسے ہی حضرت قلندر شہباز کی ولادت کے وقت بھی ہوا۔

قلندر نامہ میں تحریر ہے کہ ابراہیم کبیرالدین کی شادی کے دن سے لے کر برابر چالیس دن تک شہر مروند میں جشن اور اتنے ہی دنوں تک دعوتیں اور محفلیں جاری رہیں۔

نسب نامہ:

آپ کا نسب امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ سید غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنی کتاب ''مآثر اکرام'' میں لکھا ہے کہ آپ کی تیرھویں پشت امام جعفر صادق سے ملتی تھی۔

''لب تاریخ سندھ اور ''محفتہ الکرام'' کے دستخطی نسخہ میں بھی آپ کا سلسلہ تیرھویں پشت پر امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے ملایا گیا ہے''لب تاریخ سندھ'' میں شجرہ اس طرح قلمبند کیا گیا ہے۔

حضرت عثمان مروندی (میمندی) عرف لعل شہباز بن سید کبیر بن سید شمس الدین بن سید نور شاہ بن سید محمود شاہ بن سید احمد شاہ بن سید ہادی بن سید مہدی بن سید منتخب بن سید خالب بن سید منصور بن سید اسماعیل بن امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ۔

تذکرہ صوفیائے سندھ کے مصنف اعجاز الحق قدوسی نے لب تاریخ سندھ کے قلمی نسخے سے شجرہ نقل کیا ہے اس میں ''قلندر نامہ'' کے برخلاف اضافہ موجود ہے یعنی سید اسماعیل بن امام جعفر صادق تک مسلسل لائے ہیں۔ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے چھ فرزند تھے۔

اسماعیل، موسیٰ کاظم، علی، عمر، محمد، اسحاق اور حسن یعنی سید محمد کا نام ان کے فرزندوں میں شامل تھا لیکن حضرت قلندر شہباز کیلئے مشہور ہے کہ یہ سید اسماعیل کی اولاد میں سے تھے اور سید اسماعیل کے فرزند کا نام سید محمود تھا۔

بستان العارفین کے مصنف سید میر حسین علی شاہ نے جو شجرہ دیا ہے وہ ہو بہو قلندر نامہ کا شجرہ ہے یعنی ۱۲ پشت والا اور جس میں سید کبیر کے بجائے سید ابراہیم تحریر ہے۔

کتاب ''تعارف ہند'' کے شجرہ میں ''ابراہیم کبیر الدین'' تحریر ہے۔

قلندر نامہ کے مصنف نے اس ضمن میں لکھا ہے کہ ''ان کے والد سید ابراہیم کو ''جوابی'' بھی کہا جاتا تھا کیونکہ فارسی کی ایک کتاب میں تحریر ہے کہ سید کبیر کا گزر ایک دفعہ ایک صحرا سے ہوا اور اس کے باوجود انہیں وضو اور غسل تک کیلئے پانی کی سہولت ملی، اس پر ان کے سائلوں اور طالبعلموں نے سوال و جواب کئے اور آپ نے انہیں مطمئن کر دیا۔

تحفتہ الکرام کے سندھی ترجمہ میں کبیر الدین بن سید صدر الدین کا نام شامل ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ترجمہ یا پھر طباعت کی غلطی ہو کیونکہ حاشیہ پر میر قانع کے دستخطوں سے جو شجرہ دیا گیا ہے اس میں سید کبیر بن سید شمس الدین ہی لکھا ہے اور مندرجہ بالا شجرہ سے مختلف ہو جاتا ہے یعنی ''سید شمس الدین بن محمد یحییٰ بن سید...... بن سید محمد شاہ بن سید احمد شاہ بن سید اہادی بن سیدی بن سید غالب بن سید منصور بن...... بن امام...... محمد جعفر صادق علیہ السلام۔

''تاریخ اولیاء گجرات'' میں جو شجرہ ہے وہ تمام شجروں سے مختلف ہے۔ ''تاریخ اولیاء گجرات'' کا شجرہ اس طرح ہے۔

''سید عثمان بن سید حسن بن سید محمود بن سید صدر الدین بن سید شہاب الدین بن نصیر الدین بن شمس الدین بن صلاح الدین بن اسلام الدین بن مومن شاہ بن خالو شاہ بن محب الدین بن محمد سبزواری بن عبد المجید بن غالب الدین بن احمد بن منصور بن

اسماعیل ثانی بن محمد بن اسماعیل عروج اکبر بن امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

خزینۃ الاصفیاء والا شجرہ اس سے بھی مختلف ہے اس میں جو شجرہ ہے وہ یہ ہے:

''سید عثمان بن حسن کبیر الدین بن شمس الدین بن سید صلاح الدین بن سید شاہ بن سید خالد الدین بن سید محبّ بن سید مشتاق بن سید نور الدین بن سید اسماعیل بن امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔''

قلندر نامہ' لب تاریخ سندھ اور تاریخ کنز الانساب میں جو شجرہ ہے اس میں سید محمد شاہ' سید نور شاہ کے والد بتائے گئے ہیں جبکہ تحفۃ الکرام میں دادا لکھا ہے۔ کتاب تعارف ہندی کے شجرہ میں والد کا نام سید مشتاق ہے۔ کئی شجروں میں سید منتخب کے بجائے سید محبّ ہے۔ کتاب تعارف ہندی والے شجرہ اور لب تاریخ سندھ کے شجرے میں سید مہدی کے دادا کا نام سید غالب اور پردادا کا نام سید منصور دکھایا گیا ہے جبکہ سید مہدی کے والد کا نام سید محمد بتایا گیا ہے۔

قلندر نامہ سندھی میں ہے کہ ''جبکہ زیادہ نسخوں میں سید منتخب ہے تو یہ ہی درست تصور کیا جاتا ہے۔''

''الشہباز'' میں جلیل سیہوانی نے سید منتخب تک لب تاریخ سندھ کا شجرہ دیا ہے اور باقی شجرہ تاریخ اولیاء گجرات سے لیا گیا ہے۔ ہم نے بھی اسی شجرہ کو معتبر تسلیم کیا ہے۔

شہباز قلندر کا وطن

''مآثر الکرام'' کے مصنف نے ''تذکرہ مشائخ سندھ'' کے حوالہ سے لکھا ہے کہ آپ کا وطن ''مرند'' تبریز کے دیہات میں سے ایک ہے۔

شیخ اکرام نے ''آب کوثر'' میں بھی یہی بتایا ہے روزنامہ ''الوحید'' کے سندھ آزاد نمبر میں بھی لکھا ہے کہ ''آپ آذربائیجان (آرمینیا) کے گاؤں ''مرند'' میں پیدا ہوئے۔''

محبوب علی چنا نے بھی ''مرند'' ثابت کیا ہے اور یہ نام ''مرند'' ہی ممکن ہے کیونکہ ''مروند'' کے نام سے ہمیں تواریخ، قدیم جغرافیوں اور سفرناموں میں کسی شہر کا نام نہیں ملتا البتہ ''مرو'' نامی شہر کا پتہ چلتا ہے جو کہ ''ہرات'' کے شمال میں کشک نامی شہر کے قریب ہے جہاں پر روس اور افغانستان کی سرحدیں آ ملتی ہیں۔ اس طرح یہ ۱۶۰ میل شمال میں ایک خشک لق و دق صحرا میں خیابان ہے۔ اس شہر کی قدامت سکندر اعظم کے عہد کے آثار سے لگائی جا سکتی ہے کہ یہ اس زمانہ تک کتنا عالیشان شہر تھا اور یہ اس زمانہ تک علم و عرفان اور آسودگی کا مرکز تھا۔ اصطخری اور مقدسی نے اس ضمن میں تفصیلی حالات درج کئے ہیں اور اسے ایک عالیشان شہر بتایا ہے۔

سلاجقہ کے زمانہ میں یہاں ایک بلند پایہ مدرسہ تھا جسے ہم یونیورسٹی کا درجہ دے سکتے ہیں۔ اس زمانہ میں اسے ''مرو'' سے ''مرادالرود'' کو جدا کرنے کیلئے ''مروا

شاہجان'' کہا جاتا تھا جو کہ آج کل روس کی حدود میں ہے۔

خراسان میں ''مرو'' کے علاوہ ''میمنہ'' نامی شہر بھی ملتا ہے جس کا پہلے ''الیھو دان'' یا ''الیھودیہ'' نام تھا جو ''جوزجان'' کے علاقہ میں ہے۔ یاقوت نے اس کا نام ''الیھودان الکبریٰ'' لکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ پہلے اس علاقے میں یہودی آباد تھے اور جب بندو کندنذرے نے بیت المقدس شہید کیا تو اس کے بعد اس شہر کا نام ''میمنہ'' یعنی مبارک شہر رکھ دیا گیا۔ یاقوت حموی اور مقدسی نے اس شہر کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

اس کے علاوہ ذابلستان میں ''میمند'' یا ''میوند'' نامی شہر بھی ملتا ہے لیکن مجھے اس میں سے کوئی بھی مناسب نظر نہیں آتا کیونکہ ''مروند'' کے علاوہ کوئی شہر آذربائیجان میں نہیں ہے اور اکثر تذکرہ گو اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت شہباز قلندر کا وطن اقدس آذربائیجان میں ہے اور آذربائیجان میں صرف ''مرند'' نامی شہر کا نام میسر ہے۔

''مرند'' کا شہر دریائے ''خدی'' کے دہانے پر درباہ کی ایک شاخ کے کنارے پر واقع ہے جو کہ خدی میں آملتی ہے۔ یہ شہر آذربائیجان کی حدود میں ہے اور تبریز سے شمال میں تقریباً ۴۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

مقدسی نے چوتھی صدی ہجری میں اس کے متعلق تحریر کیا ہے کہ اس میں ایک چھوٹا سا قلعہ اور خوبصورت سی مسجد ہے اور شہر کی بیرونی آبادی باغات سے بھری ہوئی ہے اور اس میں ایک صاف ستھرا اور بارونق بازار ہے۔

یاقوت نے لکھا ہے کہ ''اس شہر کو ''کردوں'' نے برباد کر دیا اور اسے لوٹنے سے پہلے یہاں کی آبادی کو قیدی بنالیا۔''

مقدسی نے لکھا ہے کہ جس دریا پر ''مرند'' واقع ہے اس کا نام ''زولو'' یا ''زکویر'' ہے اور یہ وسیع اور عالیشان شہر ہے اور یہ شہر ''سرخ رنگ'' بنانے کی صنعت میں شہرہ آفاق ہے۔ شہر کے گردونواح میں سات گاؤں یا قصبات ہیں جو سب اس میں شامل ہیں۔

مذکورہ حقائق و دلائل کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اس کا اصل نام

''مرند'' ہے لیکن بعد میں لوگوں نے ''ی'' ''و'' کا اضافہ کر لیا اور اس طرح اب اسے ''مروندی'' کہا جاتا ہے۔ تعجب ہے کہ خود قلندر شہباز نے اپنے ایک شعر میں اسے ''مروند'' استعمال کیا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دوسرے ممالک بالخصوص برصغیر میں ''مرند'' کو ''مروند'' کہا جاتا ہے۔ اسی لئے خود قلندر شہباز نے دوسرے ممالک کی سیاحت کے بعد اس کا نام ''مرند'' تحریر کیا ہے اور سندھ میں عام طور پر ''مروند'' مشہور ہے۔ حدیقتہ الاولیاء میں ان کی شان میں جو قصیدہ ہے اس کے بیت میں بھی اسے ''مروند'' کہا گیا ہے۔

دمبدم رحمت خداوندی باد برروح شاہ مروندی

ولادت

قلندر نامہ سندھی (ص ۳) نے ایک صاحب کا شعر نقل کیا ہے جس سے لعل شہباز کی ولادت کا سن عمر اور وفات کا سن نکل آتا ہے:

بجو تاریخ شمس الدین عثمان

بدر کن رنج از فلک کرامت ۵۳۸ھ

سن عمرش "ولی اللہ" وفاتش ۱۱۲ھ

سروش غیب می گوید "برحمت" ۶۵۰ھ

لب تاریخ سندھ ص ۶

اس کے مطابق ولادت کا سن ۵۳۸ھ ثابت ہوتا ہے۔ بستان العارفین (ص ۳۳) نے بھی اسی سن ولادت پر اتفاق کیا ہے جبکہ لب تاریخ سندھ (ص ۶) پر ۵۷۳ھ ولادت کا سن تحریر ہے اور تذکرہ صوفیائے سندھ (اُردو) ص ۱۹۹ پر بھی اعجاز الحق قدوسی نے لب تاریخ سندھ سے سند کے طور پر مستعار لیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں اتنا حسن و جمال عطا کیا تھا کہ ان کی پیشانی کے نور کے آگے چاندنی بھی مات تھی۔

روایت ہے کہ قلندر شہباز بچپن سے ہی اعلیٰ درجات کے مالک تھے اور بہت سے معجزات دکھلائے۔ اس کیلئے آپ کی والدہ ماجدہ اور دایہ بھی حیران رہ جاتی تھیں۔ کئی

دفعہ آپ نے بڑوں کی طرح دایہ سے کلام کر کے اسے حیران و پریشان کر دیا۔

مخزن راز میں مولوی فتح محمد صاحب نے بھی آپ کو بچپن سے ہی برگزیدہ اور آپ کی کرامت کا تذکرہ کیا ہے اور یہ شعر بھی کہا

بگہوارہ گویا است از بخت او

دلیل نہ جابت کہ روشن تر است

آپ نے کم عمری میں یعنی سات برس کی عمر میں ہی پورا قرآن شریف حفظ کر لیا تھا۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ آپ مکتب کے دوسرے لڑکوں کی کتابیں لے جا کر چشمہ میں ڈبو دیتے تھے اور پھر ان کے اصرار کرنے پر نکال کر ان کو لا کر دیتے تھے۔ لڑکے اپنی کتابیں صحیح وسلامت اور پانی کے اثر سے محفوظ پا کر حیران رہ جاتے تھے۔

جب آپ کی عمر بارہ سال ہوئی تو آپ اپنے کسی اور ساتھی کو ساتھ لے کر شہر سے نکل کر کسی ایسے مقام پر چلے جاتے تھے جہاں خاردار جھاڑیاں وغیرہ ہوں۔ وہاں پہنچ کر آپ اپنے ساتھی کو ڈھول بجانے کو کہتے تھے جو کہ اپنے ساتھ لاتے تھے۔ قلندر شہباز سوائے لنگوٹ کے جو بچپن سے باندھا تھا' تمام کپڑے اتار کر ڈھول کی آواز پر رقص کرنے لگتے تھے۔ یہاں رقص سے وہ مراد ہرگز نہ لی جائے جیسے کچھ فقیر گھنگھرو باندھ کر کمر اور ہاتھوں کی اداؤں سے ناچتے نظر آتے ہیں۔

رقص کے دوران آپ ایک سحر انگیز کیفیت سے دوچار ہوتے تو آپ ان خاردار پودوں اور جھاڑیوں پر وجدانہ رقص کرنے لگتے تھے۔ رقص کے دوران آپ اپنے جسم کو اس طرح کانٹوں پر کھینچتے تھے کہ وہ بری طرح زخمی ہو کر لہولہان ہو جاتا تھا۔ آپ پر یہ مستی اس وقت تک طاری رہتی تھی جب تک آپ کا پورا جسم خون سے سرخ نہ ہو جاتا تھا۔ آپ اپنے ایک شعر میں فرماتے ہیں۔

از عشق دوست ہر ساعت دورون نار می رقصم

گہے در خاک نی غلطم' گہے برخار می رقصم

میں دوست کے عشق میں ہر وقت آگ پر رقصاں رہتا ہوں کبھی خاک پر تو کبھی کانٹوں پر۔

روایت ہے کہ جب آپ کا جسم خون سے سرخ ہو جاتا تو آپ وفور جوش سے وہیں کھڑے کھڑے زمین میں غوطہ لگا جاتے۔ اس غوطہ لگانے والی جگہ سے آپ کے ساتھی کو ایک لعل ملتا تھا۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ کے والد ماجد سے آپ کے کچھ دوستوں نے جا کر کہا کہ آپ کا فرزند ایک ڈھول بجانے والے پیشہ ور کے ساتھ جنگل میں جاتا ہے نہ معلوم وہ وہاں جا کر کیا کرتے ہیں۔ موقع پا کر سید ابراہیم کبیر الدین اپنے چند دوستوں کے ساتھ وہاں جا پہنچے اور چھپ کر سارا منظر دیکھا۔ جب قلندر وجدانی کیف میں زمین میں غوطہ لگا گئے تو آپ انتہائی حیران و پریشان ہوئے لیکن ڈھول بجانے والے سے حقیقت معلوم کر کے شہر میں واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ فرزند جھولی میں کھجوریں لئے چھوٹے چھوٹے بچوں میں تقسیم کر رہے ہیں۔

آپ کے والد ماجد نے جب ایسے معجزات و کرامتیں بچشم خود مشاہدہ کیں تو متاثر ہو کر انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

روایت ہے کہ ایام جوانی میں قلندر شہباز اکثر وجد میں آ کر رقص کرتے تھے اور قوت پروردگار کے دیدار کیلئے کئی کئی دن تک ایک ہی جگہ جمے رہتے تھے۔ ایک دن اسی حالت میں اپنے مکان کی بالکنی سے ایک امیرزادی کی نظر آپ پر پڑی۔ اول تو آپ حسین و جمیل تھے دوسرے اس وقت آپ عشق الہٰی میں ڈوبے تھے۔ وہ لڑکی ایسے یوسف ثانی کی صورت دیکھ کر ایسی بے خود ہوگئی کہ اس کا کھانا پینا حرام ہوگیا اور بیمار ہو کر بستر پر دراز ہوگئی۔ ماں باپ نے حکیموں کو بلا لیا اور بھی جتن کئے لیکن اس کے مرض کا علاج سوائے محبوب کے وصال کے اور کوئی نہیں تھا۔ سہیلیوں کے ذریعہ اس سے یہ حقیقت اس کی ماں کو معلوم ہوئی اور اس کے ذریعہ اس کے باپ کو۔ دونوں نے فیصلہ کیا

کہ اگر لڑکی کی شادی ایسے شہزادہ سے ہو تو اس سے بڑھ کر اور کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے لٰہذا اس رشتہ کیلئے کوشاں ہوئے۔ لیکن یہ مجرد کہنے لگا کہ ہم ایسے گورکھ دھندوں سے ہمیشہ دور رہتے ہیں۔ ہم بہت پہلے اپنے حقیقی محبوب کے ہو چکے ہیں۔ الغرض ایک طرف وہ امیر اور دوسری طرف آپ' جب آپ نے دیکھا کہ ایسا جواب دینے کے باوجود بھی پیچھا نہیں چھوٹتا تو آپ نے یہ کہہ دیا کہ اس کا جواب ہم دو چار دن میں دے دیں گے۔ امیر نے آ کر اپنی بیٹی کو ماجرا سنایا۔

دوسری طرف قلندر شہباز اپنی داڑھی مونچھیں ابرو اور سر کے بال وغیرہ منڈوا کر' لنگوٹ باندھ کر' منہ اور تمام جسم پر راکھ مل کر اسی جگہ پر جا بیٹھے جہاں اس امیرزادی نے پہلے آپ کو دیکھا تھا۔

دوسرے دن صبح سویرے حسب معمول جیسے ہی وہ آپ کے دیدار کیلئے کھڑکی میں آ کر کھڑی ہوئی تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ ہوئی۔ جب اس نے وہاں ایک حسین و جمیل نوجوان کے بجائے ایک سوگ میں بیٹھے ہوئے بھبوتیے سامی کو دیکھا۔ پہلی نظر میں وہ پہچان نہ سکی لیکن جب غور سے دیکھا تو نقش و نگار سے معلوم ہوا کہ یہ وہی شخص ہے۔ چونکہ وہ صرف آپ کی صورت پر فریفتہ تھی لٰہذا اس کے دل سے وہ محبت معدوم ہو گئی۔ اس طرح آپ نے اپنی جان چھڑائی۔

بیعت اور سلسلہء طریقت

صاحب مآثر الکرام نے لکھا ہے کہ جب آپ سن بلوغت کو پہنچے تو بابا ابراہیم کے پاس گئے اور بیعت کی سعادت حاصل کی۔ بابا ابراہیم شیخ جمال مجرد کے مرید تھے۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نجیب الدین علی بن برعش شیرازی کے ہمعصر شیخ ابراہیم مجذوب نامی ایک بزرگ ہوگزرے ہیں۔ شیخ نجیب الدین کی وفات سنہ ۵۷۸ھ میں ہوئی۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ ہی بابا ابراہیم ہوں۔

بابا ابراہیم کے متعلق روایت ہے ان کی مسجد میں ایک پتھر رکھا ہوا تھا جس کو وہ کئی مرتبہ ہاتھ میں اٹھاتے تھے اور پھر رکھ دیتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ وہ ہی پتھر ہو جو حضرت قلندر شہباز کو مرشد کی طرف سے ملا تھا اور ''گلوبند'' کے نام سے مشہور ہوا۔

مآثر الکرام نے مرید ہونے کے سلسلے میں ایک روایت اس طرح بیان کی ہے۔

''ایک رات ابراہیم ولی نے دیکھا کہ ایک خوبرو جوان سرخ لباس میں بیٹھا ہے۔ انہیں کشف کے ذریعہ معلوم ہوا کہ یہ سید عثمان ہیں۔ یہ معلوم ہونے کے بعد بابا ابراہیم نے ان سے ملاقات کی اور حضرت قلندر لعل شہباز باطنی اشارے کے مطابق قلندری طریقت پر ان کے مرید ہوئے۔ ایک سال ان کی خدمت میں رہ کر کمالیت کو پہنچے اور خلافت کا خرقہ حاصل کیا۔''

بابا ابراہیم نے انہیں ایک سنگ مقبول عطا کیا جواب گلو بند کہا جاتا ہے جو کہ انہیں (بابا ابراہیم کو) ان کے مرشد سید جمال مجرد سے ملا تھا۔ یہ گلو بند آج بھی حضرت قلندر شہباز کے مقبرے میں لٹکا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ انہیں مرشد سے بادام کی ایک عصا عطا ہوئی تھی جواب مقبرے میں شمال کی طرف رکھی ہوئی ہے۔ ایک روایت کے مطابق یہ دونوں چیزیں حضرت قلندر شہباز نے بغداد میں سید علی کو دی تھیں اور وہ ہی ان کو سیہون لائے تھے۔ ایک یہ روایت بھی ہے کہ دراصل یہ چیزیں امام زین العابدین کی تھیں اور دست بدست قلندر شہباز تک پہنچیں۔ امام عالی مقام تک پہنچنے کے سلسلے میں بھی مختلف روایات ہیں۔ ایک روایت یہ ہے یہ پتھر امام زین العابدین کی اسیری کی یادگار ہے۔ جب یزیدی فوج نے آپ کو پابند سلاسل کیا تھا تو یہ پتھر اس وقت ان کے گلے میں طوق کے طور پر ڈال دیا گیا تھا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ یہ حجر اسود کا ٹکڑا ہے جو ان کو اپنے اجداد سے ملا تھا' ہوتے ہوتے امام زین العابدین اور اس کے بعد حضرت قلندر شہباز تک پہنچا۔

سید جمال شاہ مجرد

"کتاب خیر المجالس" میں تحریر ہے کہ سید جمال شاہ مجرد ایک عرصے تک مصر میں رہے اور وہاں کے لوگ آپ کو کتب خانہ جاری کہتے تھے کیونکہ ان سے جو بھی مسئلہ دریافت کیا جاتا تھا۔ اس کا جواب فوراً دیتے تھے اور کسی کتاب وغیرہ کی طرف رجوع نہ کرتے تھے۔ گویا علم کی ساری حقیقت آپ کے قلب مبارک پر نقش شدہ اور تمام کتابیں آپ کے حافظے میں محفوظ تھیں۔ اس لئے آپ کو کوئی کتاب دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی تھی۔

سید جمال شاہ مجرد انتہائی کمالیت اور جمالیت والے تھے۔ آپ کا ظاہری حسن و جمال بھی ایسا تھا کہ مصر کے لوگ آپ کو یوسف کہتے تھے۔

کتاب مذکور میں ہے کہ جس طرح زلیخا حضرت یوسف پر عاشق ہوئی تھی اسی

طرح مصر کی عورتوں میں سے ایک مشہور عورت حضرت شاہ جمال پر مفتوں ہو گئی اور شوق وصال کی وجہ سے انتہائی غمزدہ و پریشان رہنے لگی اور دن رات میں کئی کئی مرتبہ انہیں کے دیدار کیلئے آتی تھی۔ حضرت شاہ جمال اس مصیبت سے بچنے کیلئے مصر سے شہر دمیات چلے گئے جو مصر سے سات آٹھ دن کے فاصلے پر واقع تھا۔ شاہ جمال اس شہر کے ایسے مکان میں آ کر رہے جو حضرت یوسف کے زمانے سے ویران پڑا ہوا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد جب اس عورت کو علم ہوا تو وہ یہ دور دراز سفر اور مصائب برداشت کر کے وہاں آ پہنچی۔ سید جمال کو جب اس کی آمد کا علم ہوا تو وہ ششدر و مضطرب ہوئے اور انتہائی عقیدت سے عرض کرنے لگے کہ خدایا! میرا یہ حسن و جمال جو میرے لئے عذاب بن گیا ہے اسے تبدیل کر دے یہ کہہ کر اپنے چہرہ مبارک پر نظر گھمائی تو داڑھی اور مونچھوں کے تمام بال گر پڑے اس لئے حسن و جمال بھی تبدیل ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت شاہ جمال نے کہا کہ جو عورت مجھ پر عاشق ہے اسے لایا جائے۔ جب اس عورت نے پیغام سنا تو وفور مسرت و جوش میں دوڑتی ہوئی آئی اور جب اس کی نظر آپ پر پڑی تو وہ اچانک تبدیلی سے بیدل ہو کر منہ پھیر کر چلی گئی۔

کتاب اخبار الاخیار میں تحریر ہے کہ مصر کے عالم سید جمال کی داڑھی اور مونچھیں صاف کرانے کی خبر سن کر بحث کیلئے آپ کے پاس آئے اور آ کر کہا کہ حضرت آپ نے داڑھی اور مونچھیں صاف کروا کر شریعت پیغمبر کے خلاف یہ کام کیوں کیا ہے؟ اس پر آپ نے فرمایا کہ اگر آپ کو داڑھی اور مونچھ ہی چاہئیں تو حاضر ہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے اپنا دست مبارک عبا میں ڈال کر جو باہر نکالا تو وہی داڑھی وہی مونچھیں موجود تھیں۔ آپ کی اس کرامت پر علماء انگشت بدنداں ہو کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

سید جمال شاہ اکثر اپنی داڑھی اور مونچھیں منڈوا دیتے تھے۔ آپ کے پاس صرف ایک اونی کمبل تھا اور وہاں کے قبرستان کی ایک پرانی قبر میں قبلہ رو ہو کر یاد الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔

اس قیام کے دوران بابا احمد ولق پوش اور سید عبدالقدوس آپ کے خاص معتقد تھے۔ کتاب سیر الاولیاء میں تحریر ہے کہ سید عبدالقدوس موصل شہر کے رہنے والے تھے جب ان پر خدائی عشق نے غلبہ کیا تو وہ پہلے کعبۃ اللہ شریف کی زیارت کیلئے مکہ معظمہ اور اس کے بعد رسول اکرم کی زیارت کیلئے مدینہ منورہ گئے۔ اس کے بعد وہ سید جمال شاہ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوکر بابا اندلس کے ساتھ ان کے مرید ہوئے۔

تذکرہ مشائخ سیوستان اور قلندر نامہ فارسی میں تحریر ہے کہ سید جمال مصر سے روانہ ہوکر عربستان کی سیر و سیاحت کرتے ہوئے کربلائے معلیٰ میں وارد ہوئے اور کچھ عرصہ تک اپنے مرشد بابا ابراہیم گرم سیل کی خدمت میں رہ کر فقیری کی امانتیں حاصل کر کے عازم ہندوستان ہوئے۔ کتاب تذکرہ شہباز میں تحریر ہے کہ بابا ابراہیم ولی بھی سید جمال شاہ مجرد کے مرید ہوئے تھے اور برابر ایک سال تک اس صاحب کمال کی خدمت کر کے بہت کچھ فیض حاصل کیا۔

سید جمال اپنے معجزات وکرامات اور علم کی طاقت سے بہت سے لوگوں کو راہ حق پر لے آئے آپ کی فقیری کا ڈنکا پورے ہندوستان میں بج گیا۔ آپ بہت سے ساحروں اور کافروں سے مقابلہ کرتے ہوئے کولا پور شہر میں وارد ہوئے جو اس وقت طریقت کا بڑا مرکز تھا۔

تواریخ میں مذکور ہے کہ کولا پور شہر میں سید شاہ جمال مجرد کے آگے ایک بڑا کڑھاؤ ہر وقت چولہے پر رکھا رہتا تھا۔ مرادیں چاہنے والے تیل لا کر اس کو کڑھاؤ میں اور کچھ لکڑیاں لا کر اس چولہے میں ڈالتے تھے۔ آگ سے تیل کھولتا رہتا تھا اور آپ کھرپی ہاتھ میں لئے تیل کو گھمانے کے ساتھ ساتھ خدائی خیال میں مستغرق رہتے تھے۔ کہتے ہیں کہ آپ بعض اوقات اپنے دونوں پاؤں جلتی ہوئی آگ میں ڈال دیتے تھے۔ یہ بات بھی مشہور ہے کہ آپ کے پاس بہت سے لوگ فقیر بننے کیلئے آتے تھے تو آپ فرماتے تھے کہ تم اس کڑھاؤ میں کود کر صحیح سلامت نکل آؤ تو تمہیں فقیر بنالیا جائے۔ اس

پر بہت سے تو بھاگ کھڑے ہوتے تھے اور جو ناقص اس میں کود پڑتے تھے تو وہ تیل میں تل کر پکوڑے بن جاتے تھے اس لئے مدارس کے لوگ آپ کو "پھچنیا" (چمڑا پوش) کہتے تھے۔

قلندر شہباز بلند پرواز اپنے تین رفیقوں کے ساتھ سیر و تفریح کرتے ہوئے کولا پور آ پہنچے اور حضرت سید جمال شاہ مجرد کے آستانہ مبارک پر آئے اور چاروں درویشوں نے اپنے طالب بننے کا خیال ظاہر کیا۔ سید جمال شاہ نے چاروں درویشوں کی خاطر تواضع کی اور اس کے بعد آپ نے سید شیر شاہ جلال سرخ پوش بخاری سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ کی پشت مبارک سے غوث اور اقطاب پیدا ہونے والے ہیں۔ اس لئے آپ اسی حال پر قائم رہیں۔ اس پر باقی رفیق خاموش بیٹھ گئے۔ اس کے بعد قلندر شہباز کڑھاؤ پر کھڑے ہو کر امر کے منتظر رہے۔ جب شاہ جمال نے آپ کا کامل شوق دیکھا تو آپ کو کڑھاؤ میں کود پڑنے کا حکم دیا۔ قلندر شہباز اپنا قلندرانہ رقص کرتے ہوئے پروانے کی طرح کڑھاؤ میں داخل ہوئے۔ ان کے رفقاء اور حاضرین کے حیرت و استعجاب کی کوئی حد نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ قلندر شہباز نے تیل میں غوطہ کیا لگایا بلکہ گم ہی ہو گئے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آپ برابر بارہ سال تک اور کچھ کی رائے میں بارہ مہینے تک اس کڑھاؤ میں گم رہے۔ آخر سید شاہ جمال مجرد نے قلندر شہباز کو آواز دی جس پر وہ صحیح سلامت ان کی خدمت میں آ کر حاضر ہوئے۔ شاہ جمال مجرد نے انہیں گلے لگا کر فرمایا بیٹا' اب تم لعلوں کے لعل (گوہروں کے گوہر) ہوا اور تم یہ فقیرانہ امانتیں جو مجھے امام زین العابدین کی طرف سے ملی ہیں مجھ سے لے لو۔

قلندر شہباز نے کچھ عرصہ اپنے مرشد کی زیارت میں گزارا۔ آخر سید جمال شاہ خدائی بلاوے پر لبیک کہہ کر اس دارالفنا سے کوچ کیا۔ قلندر شہباز نے اپنے مرشد کا مزار آستانہ کے قریب ہی بنوایا۔ جو ایک مشہور و معروف زیارت گاہ ہے۔ وہ کڑھاؤ آج بھی وہاں موجود ہے۔

داڑھی وغیرہ صاف کرانے کی رسم

سید جمال مجرد کی وجہ سے رسم رائج ہوگئی کہ جب بھی کوئی قلندری طریقت میں داخل ہوتا داڑھی، مونچھ بھنویں اور سر صاف کرواتا یہ رسم اب بھی موجود ہے۔

شجرۂ طریقت

شجرۂ طریقت کے متعلق

قلندر نامہ سندھی کے مصنف کا دعویٰ ہے کہ قلندر شہباز کا سلسلہ قلندری امام زین العابدین کے واسطے سے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچتا ہے کیونکہ یہ سلسلہ سید جمال سے حضرت علی بن موسیٰ رضا، امام جعفر صادق امام زین العابدین اور حضرت علی سے ہوتا ہوا سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔

کئی تذکرہ نگاروں نے قلندر شہباز کا سلسلہ طریقت قادری بتایا ہے۔ تذکرۃ الفقرا میں دارا شکوہ کا جو شجرہ ہے وہ لعل شہباز کے واسطے سے حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تک اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''دارا شکوہ مرید ملا شاہ بدخشی مرید میاں میر سیوھانی مرید حضرت خضر سیوستانی مرید شاہ سکندر مرید خواجہ خانی مرید سید علی قادری مرید حضرت مخدوم سید عثمان شہباز مرید شاہ جمال مجرد مرید شیخ ابو اسحاق ابراہیم مرید مرتضٰی سبحانی مرید حضرت احمد بن مبارک مرید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے۔''

اس طرح بعض حضرات حضرت قلندر شہباز کا سلسلہ حضرت غوث اعظم سے ملاتے ہیں۔ میر کامل الدین دیوان حافظ کی شرح میں صاف لکھتے ہیں کہ شہباز قلندر کا سلسلہ امیر المومنین تک پہنچتا ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے پتہ چلتا ہے کہ شہباز قلندر اور سید جمال اور حضرت بابا

ابراہیم کی طریقت ایک انوکھی طریقت تھی اور وہ طریقت قلندری کہلاتی ہے۔ اس طریقت کے سلسلے میں صاحب ''طبقات الصوفیہ'' نے لکھا ہے کہ:

''تارک الدنیا تہجد گزار اور نفسانی لذتوں سے پاک فرد کو قلندر کہتے ہیں۔''

کشف اللغات میں ہے کہ ''قلندر اسے کہا جاتا ہے کہ جو دنیا سے آزاد ہو کر صرف معبود میں محو ہو جائے۔''

''مصباح الہدایہ'' میں تحریر ہے کہ ''قلندری طریقت والے فرض سے زیادہ نہ نماز پڑھتے ہیں اور نہ ظاہری عابدوں کی طرح عبادت کرتے ہیں بلکہ مخفی طریقہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ دنیا کی دولت سے بے غرض یہ اپنے فرائض کی بجا آوری میں لگے رہتے ہیں۔''

حافظ شیرازی نے بھی اسی موضوع پر اس طرح اشارہ کیا ہے اور قلندر کی شان میں فرمایا ہے کہ:

ہزار نکتہ باریک ترز مواینجا است
نہ ہر کہ سربہ تراشد قلندری داند

قلندر نامہ فارسی کے مصنف نے اس مشرب کے سلسلے میں بخاری شریف کی اس حدیث کو بنیاد بنایا ہے کہ:

''صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بن عبداللہ سے یہ روایت کی ہے کہ نجد سے ایک اعرابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوا اور نہایت آہستہ آواز میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسی ہدایت کی درخواست کی جس سے وہ جنت حاصل کر سکے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا خدا کی عبادت کر، شرک نہ کر، فرض نماز ادا کر، زکوٰۃ دے، رمضان کے روزے رکھ۔'' پھر اس نے کہا کچھ اور آپ نے فرمایا پھر زیادہ نفل پڑھ، پھر نجدی نے کہا قسم اس ذات کی کہ جب تک مجھ میں ایک سانس بھی باقی ہے میں

نہ اس سے کم کروں گا اور نہ زیادہ۔"

جب نجدی چلا گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے بہشتی ہونے کی بشارت دی۔

مندرجہ بالا بیان سے صاحب قلندر نامہ نے یہ مطلب اخذ کیا ہے "کہ فرائض ادا کرنا جنت میں داخل ہونے کا ذریعہ ہے۔" گویا اس اعرابی کا مشرب بھی قلندری تھا۔

غرضیکہ طریقہ قلندری میں صحیح قلبی اعمال پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے اور ہمہ وقت مشغول بہ حق رہنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ یعنی عرفان نفس، راضی بہ رضائے حق رہنا، استغفار، اعلیٰ ہمتی، عمل پیہم اور نفس کے ساتھ جہاد قلندریت کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی قلندریت کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ اقبال کے نزدیک قلندر وہ ہے جس کے دل میں دنیا کے مظہرات اور مشکلات کا خوف و ہراس نہ ہو۔

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

قلندر کو جو روحانی فتوحات حاصل ہوتی ہیں وہ کسی بادشاہ کی فوجیں بھی حاصل نہیں کر سکتیں علامہ اقبال فرماتے ہیں:

دبدبۂ قلندری ، طنطنہ سکندری
آں ہمہ جذبۂ کلیم ایں ہمہ سحر سامری
آں بہ نگاہ می کشد ایں بہ سپاہ می کشد
آں ہمہ صالح و آشتی ایں ہمہ جنگ و داوری

مستی:

طریقہ قلندری کا راز مستی میں مضمر ہے۔ حضرت قلندر شہباز رحمۃ اللہ علیہ کے فکر و عمل کا مرکزی نکتہ مستی ہے۔ آپ نے عشق و محویت کے رنگ میں خودشناسی اور

خوداعتمادی کا درس دیا ہے آپ کی مستی کی تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے کہ مستی جذباتی اور تصوراتی، انسان کی ہمت کا مظہر ہے جو حق اور انصاف سے نمودار ہوتی ہے اور حالات کے دستور کے موافق عمل کا رخ اختیار کرتی ہے جو تردد اور تاویلات کی توہمات سے بالاتر ہوتی ہے۔ یعنی مستی کا مفہوم عمل صالح میں مضمر ہے اور عمل بھی وہ جو ناکامی سے روشناس نہ ہوتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مستی کی وجہ سے زندگی جہد مسلسل بن جاتی ہے، سلاطین کے محلوں میں زلزلہ پیدا کر دیتی ہے اور لاکھوں انسانوں کی سیاسی، روحانی، ذہنی اور اخلاقی اصلاح کا باعث بنتی ہے۔ غرضیکہ مستی عشق کی ارفع اور اعلیٰ منزل ہے اور جوش، جذبہ، محویت اور استغراق اس کی خصوصیات ہیں۔

شہباز قلندر نے بے شمار معجزات و کرامات دکھا کر لوگوں کو صحیح اسلام سے روشناس کیا اور آپ بہت سے نومسلموں کو جو اسماعیلیہ کے ہاتھوں صرف نام کے مسلمان ہوئے تھے اور سوائے اسماعیلیہ کی امامت کا اقرار کرنے کے ان میں اور کوئی اصول یا فروغ نہ تھا۔ اسماعیلیہ کے پنجے سے نکال کر صحیح اسلام پر لے آئے۔

کہتے ہیں کہ جب آپ جوناگڑھ کے شہر میں آئے تو ایک درویش نے آپ سے عرض کیا کہ ایک جنبیل اور ایک ڈنڈا کہیں سے نمودار ہو کر اس شہر سے خیرات لے جاتے ہیں۔ بہت کوشش کرتا ہوں لیکن ہاتھ نہیں آتے۔ آپ ان کے آنے کا وقت معلوم کر کے چلے گئے اور پھر اس مقررہ وقت پر وہاں آئے۔ آپ نے دیکھا کہ واقعی ایک جنبیل اور ایک ڈنڈا از خود شہر میں گدائی کر رہے ہیں۔ آپ نے ہاتھ بڑھا کر وہ جنبیل اور ڈنڈا پکڑ کر درویش کے سامنے رکھا اور اس درویش کو کہا کہ ڈنڈا مجھے دے دو اور جنبیل تمہاری ہے۔ اب سے جنبیل شاہ داتا ہے جو کوئی تمہاری اس جنبیل سے کھائے گا وہ فیض حاصل کرے گا۔ فقراء سے اکثر سنا گیا ہے کہ ہندوستان کی سیر و سیاحت کے دوران بوعلی قلندر نے بھی کئی مرتبہ آپ سے مقابلے کیے تاہم اکثر مقابلے افسانوی اور بعد کے لوگوں کے تعصب کی علامت ہیں۔ چند ایسے مقابلے یہاں بیان کیے جاتے

ہیں۔

۱۔ ایک مرتبہ بوعلی قلندر، قلندر شہباز کے سامنے ایک کچی دیوار پر چڑھ کر اسے سواری کی طرح دوڑاتے گئے۔ قلندر شہباز نے اسے کھڑا کر دیا۔

۲۔ قلندر شہباز فقیرانہ پوش پہننے کے بعد ہمیشہ شیر کی سواری کرتے تھے اور ایک سیاہ سانپ بطور چابک آپ کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ اسی حالت میں آپ بو علی قلندر کے مہمان ہوئے۔ خاطر تواضع کے بعد بوعلی قلندر نے آپ سے دریافت کیا کہ آپ کا شیر اور سانپ کیا کھاتے ہیں؟ کہا کہ ہمارا شیر گائے اور سانپ مرغ کھاتا ہے۔ بوعلی قلندر نے شیر کو گائے کے باڑے میں اور سانپ کو مرغ کی ٹوکری میں بھیجنے کیلئے گزارش کی۔ اس پر آپ نے شیر اور سانپ کو اپنی اپنی خوراک کی طرف روانہ کیا لیکن بوعلی قلندر کے اشارہ پر گائے شیر کو اور مرغ سانپ کو کھا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد قلندر شہباز نے اپنی سواری اور چابک طلب کی اور کہا کہ زمین بھی کسی کی امانت ہضم نہیں کرتی۔ لہٰذا آپ میری امانتیں واپس کریں۔ اس پر بوعلی قلندر نے گائے اور مرغ کی طرف اشارہ کیا۔ قلندر شہباز نے شیر اور سانپ کو آواز دی تو وہ فوراً گائے اور مرغ کے پیٹ میں سے صحیح وسلامت باہر نکل آئے۔ قلندر شہباز نے ان سے پوچھا کہ تمہیں یہ کیسے کھا گئے؟ اس پر انہوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم مہمان تھے اس لئے ہم نے اپنی طاقت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ آپ نے انہیں حکم دیا کہ وہ گائے اور مرغ کو کھا جائیں اور انہوں نے دونوں کو پل بھر میں ہضم کر لیا۔ اس کے بعد آپ نے بوعلی قلندر کو کہا کہ تم نے ہماری امانت میں خیانت کی اسی طرح کل تمہارے فقراء ہمارے فقراء کی امانتیں ہضم کریں گے لہٰذا ہم تمہارا فقر بند کئے دیتے ہیں۔ البتہ تمہاری فقیری اور لنگر کو جاری رکھا جاتا ہے۔ اس لئے قلندر شہباز کا فقر قائم اور بوعلی قلندر کا فقر ختم ہے۔ البتہ ان کی درگاہ کا لنگر آج تک جاری ہے۔

تاہم شواہد اور زمانے کے تعین سے یہ سب واقعات گھڑے ہوئے قصے ثابت ہوتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ ایک دن آپ نے کہیں جاتے ہوئے راستے پر ایک عورت کو روتے ہوئے دیکھا۔ آپ نے آگے بڑھ کر اس سے رونے کا سبب دریافت کیا جس پر اس نے کہا کہ میرا بیٹا گم ہو گیا ہے۔ آپ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ تم فکر نہ کرو ہم تمہارا بیٹا ابھی ڈھونڈ لاتے ہیں۔ یہ کہہ کر آپ اس طرف روانہ ہوئے جس طرف اس لڑکے کے پاؤں کے نشان تھے۔ آپ منڈلی میں جا گھسے جہاں سات مہنت جادوگر رہتے تھے۔ آپ کے پہنچنے سے پیشتر وہ جادوگر اس لڑکے کو ہضم کر چکے تھے۔ آپ نے لڑکے کو آواز دی تو وہ ایک دھماکے کے ساتھ ان کے پیٹ میں سے نکل گیا۔ آپ نے ان جادوگروں کو ڈانپ ڈپٹ کر لڑکے کو لا کر اس کی ماں کے حوالے کیا لیکن وہ لڑکا قلندر شہباز کے اثر سے درویش بن چکا تھا لہٰذا وہ درویش بن کر رہا اور جمن شاہ درویش کے نام سے مشہور و معروف ہے۔

اس کے بعد قلندر شہباز نے ہندوستان کے چپے چپے میں اپنے معجزات اور کرامات دکھا کر حق کی تبلیغ کی اور بہت سے مصنوعی گروہوں کو ناقص ثابت کر کے انہیں اپنی طریقت میں شامل کیا۔ ہندوستان میں قلندر شہباز کے دکھائے ہوئے معجزات و کرامات کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ ان کو یکجا کرنے کیلئے ایک ضخیم کتاب درکار ہو گی۔ آپ کے معجزات و کرامات کے اثر کا یہ ثبوت کافی ہے کہ آپ کے بعد جب آپ کے فقراء ہندوستان میں وارد ہوئے تو ہر جگہ ان کی عزت و احترام کیا گیا اور انہیں امن و امان سے قلندری طریقت کی تبلیغ کا موقع دیا گیا۔ آج تک ہندوستان کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں قلندری فقراء کے آستانے قائم ہیں۔ آپ کے فقراء کو ہندوستان میں مرشد جلال شاہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور ان کی تمام فقیری گروہوں سے زیادہ عزت کی جاتی ہے۔

کہتے ہیں کہ جب قلندر شہباز نے اپنی قلندری طریقت کا تاج پہنا اور اپنے طالب بنانے لگے تو آپ کے رفقاء میں سے شیر شاہ جلال سرخ پوش نے اپنے فرزند سید علی شاہ سرمست کو آپ کی طلب میں دے دیا۔ اس طرح اور بھی بہت سے سالک آپ کی طلب کے شیدائی بن کر آپ کے اشارہ سے آپ کے ساتھ سیہون میں وارد ہوئے۔

کتابوں میں ہے کہ قلندر لعل شہباز سیہون میں وارد ہونے کے بعد پہلے اس مکان پر آ کر ٹھہرے جو آپ کے روضے کے مغرب میں ہے اور جو اس وقت محفل خانہ کہلاتا ہے اس جگہ پر ایک خاردار درخت اب بھی موجود ہے جس کے چاروں طرف سے دیوار کر دی گئی ہے۔ ان دنوں اس آستانے کے اردگرد فاحشہ عورتوں نے اپنے اڈے قائم کر رکھے تھے جس رات کو آپ یہاں پر آ کر بیٹھے اس رات کو جتنے بھی آدمی عیاشی کے ارادے سے ان عورتوں کے پاس گئے ان میں سے کوئی بھی کامیاب نہ ہوا۔ صبح کو اس واقعے نے پورے شہر میں ہلچل مچا دی اور ہر جگہ یہ ہی چرچا ہونے لگا۔ جب ان عورتوں نے اپنے محلے کے قریب ایک درویش بیٹھا ہوا دیکھا تو سمجھ گئیں کہ یہ کرامت ضرور اس درویش کی ہے۔ لہٰذا تمام عورتیں حضرت قلندر شہباز کی خدمت میں چلی آئیں اور آ کر عرض کیا کہ جناب آپ نے یہاں قیام کر کے ہمارا کاروبار بند کر دیا ہے۔ اس کیلئے آپ ہمیں معاف کریں۔ آپ نے فرمایا کہ ہمیں خدا تعالیٰ کی طرف سے معلوم ہوا ہے کہ ہماری آخری آرام گاہ اسی جگہ پر ہوگی لہٰذا تم کسی اور جگہ جا کر رہو۔ اس پر عورتیں یہ فریاد شہر کے حاکم جسیر جی کے پاس لے گئیں جو چوپٹ راجا کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے فریاد سننے کے بعد اپنے وزراء اور ماہرین نجوم سے مشورہ کیا تو انہوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ یہ وہی درویش ہے جس کے ہاتھوں آپ کی موت واقع ہوگی۔ وہ فقیر جس کو آپ نے قتل کروا کر اس کا گوشت قصاب کے ہاتھوں فروخت کروایا تھا اور جب لوگوں نے اس گوشت کو پکا کر کھانے کا ارادہ کیا تو ہر بوٹی سے یہ

آواز آنے لگی کہ مت کھاؤ۔ میرا مرشد لعل آ رہا ہے شاید اس درویش کا مرید تھا۔ اس لئے ہماری رائے تو یہ ہے کہ آپ اس فقیر کے گوشت کی تمام بوٹیاں منگا کر رکھیں اور ایک ریشمی جوڑا اور ایک گھوڑا سونے کے ساز و سامان کے ساتھ بطور نذرانہ اس درویش کے پاس بھیج دیں' اور اسے عرض کریں کہ وہ اس جگہ سے کسی اور جگہ منتقل ہو جائے۔

راجہ اس پر آمادہ ہو گیا اور ایک وزیر کو یہ کام سرانجام دینے کا حکم دیا۔ وزیر آ کر قلندر شہباز کا قدم بوس ہوا اور قیمتی جوڑا اور گھوڑا پیش کیا۔ آپ نے دونوں چیزیں لے کر جلتی ہوئی آگ میں جھونک دیں جو معدوم ہو گئیں۔ یہ دیکھ کر وزیر کانپ اٹھا اور قلندر شہباز کے قدموں میں گر پڑا۔ آپ نے اسے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اپنے راجہ سے جا کر کہو کہ وہ ہمارے بودلہ فقیر کی بوٹیوں کی دیگ کے ساتھ ہمارے پاس آئے۔ راجہ نے ایسا ہی کیا۔ جب وہ سامنے آیا تو آپ نے دریافت کیا تم نے ہمارے بودلہ فقیر کو ہنود قصاب کے ہاتھوں کیوں قتل کرایا ہے؟ اس پر راجا نے مودب ہو کر کہا' حضور میرے قلعے کے جنوبی حصہ میں ایک کھڑکی ہے جہاں میری لڑکی ہر روز سنگھار کرنے کے بعد جا کر بیٹھتی ہے۔ اس کھڑکی کے سامنے جھاڑیوں میں آپ کا یہ فقیر بھی رہتا تھا۔ جو اپنی داڑھی سے زمین کو جھاڑ کر یہ کہتا رہتا تھا کہ مرشد لعل آتا ہے۔ کب آتا کہاں سے آتا ہے؟ لیکن عام طور پر یہ مشہور تھا کہ فقیر میری لڑکی پر عاشق ہے اور اسی وجہ سے یہاں مقیم ہے اس لئے میں نے رسوائی سے بچنے کی خاطر اسے مدعو کر کے اپنے پاس بلا کر ہنود قصاب کے حوالے کیا جنہوں نے کھانے کے بہانے سے ذبح کر کے اس کا گوشت فروخت کر ڈالا۔ اس پر آپ نے کہا کہ تم نے بغیر تحقیقات کے ہمارے فقیر کو بے گناہ قتل کروا کر ایک بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے لیکن چونکہ تم کافر ہو لہٰذا ہم تمہیں موقع دیتے ہیں کہ تم خدا کے خوف سے ڈر کر اس کا بتایا ہوا سیدھا راستہ اختیار کرو۔ یہ کہہ کر آپ نے تین مرتبہ بودلے کو آواز دی۔ وہ مرشد مرشد کہتا ہوا صحیح سلامت دیگ سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور آ کر قدم بوس ہوا۔

کہتے ہیں کہ بودلہ بہار کے زندہ ہونے کے بعد اس کے جسم کے بعض حصوں سے گوشت غائب تھا کیونکہ بوٹیوں کے آواز کرنے کے بعد بھی بعض ضدی آدمی انہیں ہضم کر گئے تھے۔ آپ نے ان بوٹیوں کو آواز دی تو وہ ان لوگوں کے سروں میں سے دھماکے کے ساتھ نکل کر اپنے سابقہ مقام پر چپک گئیں اور ان لوگوں کے سروں پر کوڑھ جیسے سفید نشانات نمودار ہو گئے جو ان کی نسل میں اب بھی دیکھے جاتے ہیں۔ جلیل سیہوانی کا دعویٰ ہے نام کے ایک شخص جس کو بجل فقیر بھی کہتے ہیں سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا جو درویش چھٹہ عمرانی کی درگاہ کا مجاور تھا۔ اس کے سر میں بھی وہ نشان جو اس کے کہنے کے مطابق انہیں بطور میراث اپنے بزرگوں سے ملا' موجود تھا۔

قلندر شہباز کے یہ معجزات وکرامات دیکھ کر فاحشہ عورتیں اپنے مکان چھوڑ کر کسی اور جگہ جا کر رہنے لگیں۔ آپ نے اپنے فقراء سے فرمایا کہ وہ ان مکانوں کو گرا کر زمین کے برابر کر دیں۔

یہ حقیقت ہر اس کتاب میں درج ہے جس میں قلندر شہباز کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ جس وقت آپ کے فقراء نے ان مکانوں کو منہدم کرتے ہوئے زمین پر قبضہ کیا اس وقت زمین کے مالک نے جو انتہائی بددماغ انسان تھا۔ آتے ہی آپ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور حملہ کرنے کی نیت سے آپ کے قریب آیا۔ آپ نے اپنی عصا سے اس مردود کو وہ ضرب پہنچائی کہ وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔ آپ نے اپنے فقیروں سے کہا کہ ایک گڑھا کھود کر اس کتے کو دفن کر دو۔ اس کے ساتھیوں نے جو یہ حال دیکھا تو انہوں نے راجہ کے پاس آ کر یہ فریاد کی۔ راجہ کو پہلے ہی قلندر شہباز پر غصہ تھا اس وجہ سے اس نے حکم دیا کہ اس خون کے الزام میں آپ کو گرفتار کر کے فوراً اس کے سامنے پیش کیا جائے۔ کہتے ہیں کہ راجہ خود فوج لے کر آپ کو گرفتار کرنے آیا۔ انہوں نے آستانے پر پہنچ کر آپ سے اس خون کے متعلق تفتیش کی۔ اس پر آپ نے برجستہ ہو کر کہا کہ ہم نے کسی انسان کا خون نہیں کیا البتہ ایک پاگل کتے کو جو ہمیں کاٹ کھانے کو

دوڑا تھا ضرور مارا ہے اور اس کو ان لوگوں کے سامنے یہاں دفن کرا دیا۔ راجہ نے زمیندار کے ساتھیوں سے اس کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ یہ فقیر جھوٹ بولتا ہے۔ اس گڑھے میں زمیندار کی لاش ہے۔ اس پر راجہ نے آپ سے مخاطب ہو کر کہا کہ اگر اس گڑھے میں سے کوئی لاش نکلی تو تمہیں اپنے ساتھیوں کے ساتھ پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ اس کے بعد گڑھے کو کھدوایا گیا تو اس میں سے ایک مرا ہوا سیاہ کتا نکلا جو دیکھ کر سب بھاگ کھڑے ہوئے۔

مشہور ہے کہ قلندر شہباز اکثر قلعے کے قریب اس جگہ پر جا کر بیٹھتے تھے جہاں پہلے بودلہ فقیر بیٹھا کرتا تھا۔

ایک دن راجہ نے ایک بلی کو ذبح کروا کر اس کا سالن پکوا کر مع روٹیوں کے آپ کی خدمت میں روانہ کیا۔ جب وہ سامان آپ کے آگے آیا تو سالن کی بوٹیوں میں سے میاؤں میاؤں کی آواز آنے لگی۔ اس پر آپ جوش میں آ گئے اور فرمایا کہ یہ کافر ابھی تک ایمان نہیں لایا۔ یہ کہہ کر آپ نے سالن کا برتن الٹا کیا تو راجہ کا تمام قلعہ الٹا ہو گیا جو اب بھی آثار قدیمہ میں شامل ہے۔

کہتے ہیں کہ جب زور کی بارش ہونے کی وجہ سے قلعے میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں تو صاف طور پر ان مکانوں کے فرش اوپر اور چھتیں نیچے نظر آتی ہیں۔

اس قلعے کے برباد ہونے کے بعد موجودہ سیہون شریف تعمیر کیا گیا ہے۔

سیر و سیاحت قلندر شہباز کا دلچسپ مشغلہ تھا اس لئے آپ ہمیشہ سفر کرتے رہتے تھے۔ آپ اکثر مشہد مقدس میں، جو مروند سے تھوڑے فاصلے پر ہے، حضرت امام موسیٰ رضا کے مزار اقدس پر جاتے تھے۔ یہ سفر آپ ننگے پاؤں اور اکثر فاقہ کی حالت میں کیا کرتے تھے۔

مطلب یہ کہ آپ کو بچپن سے ہی مصائب و مشکلات پسند تھیں۔ قلندر شہباز کو امام موسیٰ رضا سے بے حد عقیدت تھی۔

مولوی فتح محمد تذکرہ شہباز میں فرماتے ہیں۔

قلندرانہ طریقت امام موسیٰ رضا سے ملتی ہے۔اسی زمانے میں آپ کی ملاقات بابا ابراہیم ولی کربلا والے سے ہوئی۔

مخزن راز میں تحریر ہے کہ ایک دن بابا ابراہیم اپنی محفل میں درس و وعظ میں بیٹھے ہوئے تھے تو اچانک ان کی نظر ایک ایسے شخص پر پڑی جس نے سرخ کپڑے زیب تن کئے ہوئے تھے اور سر پر زرین کلاہ تھا۔ چہرہ نورانی اور مانند شمع تھا۔ یہ دیکھ کر بابا ابراہیم حیرت و استعجاب میں پڑ گئے کہ ایسا عالی مرتبہ شخص کون ہے کہ اس وقت عالم باطنی یا الہام سے اس کو معلوم ہوا کہ یہ سید عثمان ہے۔ بابا ابراہیم قدس سرہ نے قلندر شہباز کو اپنی چھاتی سے لگا لیا اور ان کو روزانہ اپنی صحبت کا شرف بخشنے لگے۔

سید بابا ابراہیم ولی مقیم سبزوار

سید بابا ابراہیم ولی امام موسیٰ کاظم کی اولاد میں سے تھے۔آپ کا حسب ونسب امام موسیٰ کاظم سے اس طرح ملتا ہے۔

سید بابا ابراہیم ولی بن سید محمود بن سید جعفر بن سید مغفور بن سید محمد بن سید علی بن سید ابی طالب بن سید محمد سید علی بن سید بیر اللہ بن سید یعلب بن سید محمد بن سید احمد بن سید محمد حسن بن سید محمد ابراہیم بن امام موسیٰ کاظم۔

سید بابا ابراہیم ولی کا خاندان کربلائے معلیٰ میں مشہور سادات میں گنا جاتا تھا۔ بابا ابراہیم ولی اپنے دور کے بڑے عالم تھے اور لوگ دور دراز مقامات سے چل کر آپ سے دینی مسائل دریافت کرنے آتے۔

آپ شریعت کے انتہائی پابند تھے۔کربلائے معلیٰ میں ریاضت ومجاہدہ کرنے کے بعد آپ کاظمین شریف آئے۔ وہاں آپ کو امام موسیٰ کاظم کے روضہ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ وہاں سے آپ تبریز اور مروند سے ہوتے ہوئے سبزوار میں مقیم ہو گئے۔ چونکہ اس ملک میں آپ کے ہم عقیدہ کثیر تعداد میں تھے اس لئے آپ نے کافی

عرصہ ان کے درمیان گزارا اور انہیں اپنے علم کی روشنی سے مستفید کیا۔

تاریخ میں ہے کہ بابا ابراہیم ولی کو اس ملک میں اس قدر لطف آیا کہ آپ نے ہمیشہ کیلئے یہیں سکونت اختیار کرلی چونکہ عالم فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ کامل ولی اللہ بھی تھے اس لئے لوگ آپ کو بابا ابراہیم ولی کربلائی کے نام سے یاد کرتے تھے۔

قلندر شہباز جب آپ کی صحبت میں آئے اور فیض حاصل کیا تو وہ آپ کے بڑے معتقد بن گئے تھے۔ یہاں تک کہ کچھ کتابوں میں تو اس طرح تحریر ہے کہ قلندر لعل شہباز بابا ابراہیم ولی کے مرید بن گئے تھے۔ تذکرہ شہباز اور تعارف ہندی میں یوں تحریر ہے کہ بابا ابراہیم ولی نے شاہ جمال مجرد سے فیض حاصل کیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ بابا ابراہیم ولی کے فقیرانہ خیالات سے متاثر ہوکر قلندر شہباز ان کے معتقد ہوگئے ہوں۔ چونکہ آپ کے والد ماجد کربلا چلے گئے تھے لہٰذا آپ کا زیادہ تر وقت بابا ابراہیم ولی کی صحبت میں گزرتا تھا۔ آخر آپ بابا ابراہیم ولی سے رخصت لے کر حج کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ اس سفر کے دوران آپ کی ملاقات شیر شاہ جلال سے ہوئی۔

شیر شاہ جلال سرخ پوش ایک باکمال بزرگ اور صاحب زہد و تقویٰ تھے۔ مشہور ہے کہ شیر شاہ جلال اپنی ریش مبارک سے سرور کائنات فخر موجودات کی بارگاہ اقدس کو جھاڑتے تھے۔ شیر شاہ جلال اور قلندر شہباز نے مل کر وہاں عبادت و ریاضت کی۔ ان دونوں بزرگوں میں قدر مشترک یک رنگی یعنی کہ دونوں سرخ لباس زیب تن کرتے تھے۔

قلندر شہباز حرمین شریف کی زیارت سے مشرف ہوکر سیر و سیاحت کرتے ہوئے روضہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زیارت کیلئے نجف اشرف تشریف لائے یہاں آپ کو بشارت ہوئی کہ تم کربلائے معلیٰ جاؤ کیونکہ تمہارے والد تمہارے فراق میں بہت ہی پریشان ہیں اور تمہیں طریقت کے امر و نواہی بھی امام حسین رضی اللہ عنہ کے روضہ اقدس سے ملیں گے۔

قلندر لعل شہباز وہاں سے کربلائے معلیٰ پہنچے اور اپنے والد بزرگوار کے قدم بوس ہوئے۔

سید ابراہیم جو عرصہ دراز سے اپنے فرزند دلبند کے کے فراق میں حیران و پریشان تھے، قلندر لعل شہباز کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور انہیں سینے سے لگایا قلندر لعل شہباز نے اپنے والد بزرگوار پر اپنا قلندری طریقہ جاری کرنے کا ارادہ کیا، جس پر سید ابراہیم نے کہا کہ میں یہ عرض امام حسین کی بارگاہ میں پیش کروں گا اور وہاں سے جو جواب ملے گا وہ تمہیں بتا دوں گا۔

چند دنوں کے بعد سید ابراہیم نے حضرت قلندر لعل شہباز کو مبارکباد دے کر فرمایا کہ تمہاری عرض حسینی سرکار میں قبول ہوئی۔ اس لئے تم اپنی منزل کو آسان تر کرنے کے بعد ہندوستان جا کر وہاں ہمارے طالب جمال شاہ مجرد سے اپنی امانتیں حاصل کرو۔

چند دنوں کے بعد سید ابراہیم جوابی مجاب نے دار فانی سے کوچ کیا، تجہیز و تکفین کے فرائض آپ کے فرزند قلندر شہباز نے ادا کئے اور آپ کا مزار شریف امام حسین کے روضہ اقدس میں بنوایا۔

سلسلہ سبزواری کے ایک بزرگ کا کہنا ہے کہ کربلا معلیٰ میں ہی ''میر کلاں'' سے آپ کی ملاقات ہوئی اور آپ نے ہی انہیں سیہون جانے کا حکم دیا۔

آپ کربلا سے بغداد آئے اور یہاں بزرگوں اور علماء سے ملاقات کی اور بغداد میں ہی سید علی سرمست آپ کے مرید ہوئے اور آپ کے ساتھ ہی سندھ آئے اور ہمیشہ شہباز قلندر کے ہمراہ رہے اور اب بھی ان کا مزار قلندر شہباز کے مزار کے باہر مسجد سے مشرق کی جانب ہے۔

بغداد سے مکران کی راہ ہوتے ہوئے سندھ میں تشریف لائے۔ مکران میں وادی پنج گور اور نہر رخشاں کے جنوب میں ایک سرسبز میدان میں چلہ کشی کی۔ یہاں ہزاروں مکرانی بلوچ آپ کے مرید ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ میدان آج بھی اسی نسبت سے

دشت شہباز کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور یہی سبب ہے کہ آج بھی جب قلندر شہباز کا عرس ہوتا ہے تو ہزاروں مکرانی بلوچ نہایت عقیدت سے سیہون آتے ہیں۔

پسنی کی بندرگاہ کے ٹیلہ کی دوسری سمت "لعل بکر" نامی ایک بزرگ کا مزار ہے۔ روایت ہے کہ یہ بزرگ ایک گڈریئے تھے اور بکریاں چرایا کرتے تھے لیکن جب یہ شہباز قلندر سے ملے تو ان کی نظر کرم سے "لعل" کا لقب حاصل کیا۔ یہ واقعہ اس امر کی شہادت کیلئے کافی ہے کہ آپ جب مکران میں آئے تھے تو یقیناً پسنی سے گزر ہوا تھا۔ اس کے بعد سفر کرتے ہوئے سندھ میں وارد ہوئے۔ سندھ کا سفر کرتے ہوئے سیہون آئے اس کے بعد سفر کرتے کرتے ملتان وارد ہوئے جہاں ان کی ملاقات غوث بہاؤ الحق زکریا ملتانی اور ان کے فرزند شیخ صدرالدین عارف ملتانی سے ہوئی یہیں حضرت جلال بخاری اور بابا فرید سے آپ کی صحبتیں رہیں اور آخری عمر تک ملاقات کا سلسلہ رہا۔ ان کے ساتھ گرمیوں میں کشمیر اور بلخ بخارا جاتے رہے جہاں آپ کے نام سے تکیے موجود ہیں۔ سردیوں میں ان کے ساتھ مل کر سندھ، پنجاب اور بلوچستان میں روحانیت کی تبلیغ کرتے رہے۔ سندھ میں کئی نشانات ایسے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے آپ حضرت غوث بہاؤالدین زکریا ملتانی، بابا فرید اور سید جلال سرخ بخاری کے ساتھ سندھ گھومتے رہے اور لوگوں کو اخلاقیات اور روحانیت کا درس دیتے رہے۔

تاریخ جنت السندھ اور دوسری کتابوں میں تحریر ہے کہ لعل شہباز قلندر نے کچھ عرصہ تک عراق میں قیام کرکے وہاں کے علماء و مشائخ کی صحبت سے استفادہ کیا اور مقامات مقدسہ کی زیارت سے فارغ ہو کر براستہ مکران سندھ میں وارد ہوئے اور اپنے ساتھیوں کو سیہون کی طرف روانہ کر کے آپ نے ملتان کا رخ کیا۔ ان دنوں دہلی کے بادشاہ غیاث الدین کا فرزند سلطان محمد شہید ملتان کا گورنر تھا جو ایک صاحب دل نوجوان تھا۔ وہ شیخ کا معتقد و قدردان تھا نہایت عزت سے بہاؤالدین اپنے پاس رکھتے تھے۔ شیخ بہاؤالدین اور شیخ فرید شکر گنج اس کے خاص مقربین امیر خسرو اور امیر حسن بھی اس کی

کی ملازمت میں تھے۔اس کی علم پروری اور درویش نوازی پورے ایشیا میں مشہور تھی۔
کتب تاریخ میں رقم ہے کہ قلندر لعل شہباز کچھ رفیقوں کے ساتھ ملتان شہر کے باہر پہنچے۔وہ رمضان کا مہینہ تھا اور سب رفیق روزہ سے تھے۔اس لئے وہ شہر سے باہر جنگل میں قیام پذیر ہوئے۔رفیقوں میں سے کوئی لکڑیاں اکٹھی کرنے میں لگ گیا تو کوئی پانی لانے کیلئے چلا گیا۔لعل شہباز گندم جو ساتھ لائے تھے پسوانے کیلئے شہر آ گئے۔

اس وقت تک گندم پیسنے کی مشین وجود میں نہیں آئی تھی بلکہ عورتیں مناسب معاوضہ لے کر چکی پر پیس دیتی تھیں۔قلندر شہباز گھومتے پھرتے ایک گھر کے دروازے پر آ کھڑے ہوئے جس میں ایک عورت گندم پیس رہی تھی۔اس نے جو یہ سراپا حسن دیکھا تو اس کی نیت میں فتور آ گیا۔وہ ایک شادی شدہ عورت تھی لیکن اس کے دل میں ہوس کی آگ بھڑک اٹھی اور بدارادہ سے بڑھ کر دروازہ تک آئی اور قلندر شہباز سے آنے کا مقصد معلوم کر کے انہیں لے جا کر اندر بٹھایا۔وہ آپ کی گندم بھی پیس رہی تھی اور ساتھ ساتھ درویش کو دیکھ کر مسکرا بھی رہی تھی۔قلندر شہباز کچھ دیر تک سر جھکا کر یاد الٰہی میں مصروف رہے لیکن جب انہوں نے محسوس کیا کہ عورت کی نیت میں فتور ہے تو وہ آٹے کو چھوڑ کر گھر سے باہر جانے لگے۔اس مکار عورت پر اس وقت بدی کا بھوت سوار تھا لہٰذا وہ آپ کا دامن پکڑ کر کہنے لگی کہ اگر تم نے میرا کہا پورا نہ کیا تو میں تم پر الزام لگاؤں گی۔قلندر شہباز نے کہا کہ اے عورت تو شادی شدہ ہے اور تمہارا اپنے مرد کے علاوہ کسی غیر مرد کی طرف دیکھنا قطعاً حرام ہے میں روزے سے ہوں۔جب اس عورت نے دیکھا کہ یہ کسی طرح بھی میرے قبضے میں نہیں آتا تو وہ چور چور کا شور مچانے لگی۔اس کی چیخ و پکار پر محلے والے اکٹھے ہو گئے اور عورت سے حقیقت معلوم کر کے دونوں کو شہر کے قاضی کے پاس لے گئے۔قاضی نے عورت سے پورا حال دریافت کرنے کے بعد قلندر شہباز سے مخاطب ہو کر کہا اے نیک انسان اس عورت نے تم پر ایک سنگین الزام لگایا ہے۔اس عورت کے الزام کے رد میں سوائے گواہ پیش کرنے کے تمہارا

چھٹکارا ناممکن ہے۔ اس پر قلندر شہباز نے کہا کہ قاضی صاحب بے عیب صرف خدا کی ذات ہے۔ کسی کے عیب ظاہر کرنا کوئی اچھا فعل نہیں ہے۔ موجودہ صوتحال کے مطابق اگر میرے لئے کوئی گواہ پیش کرنا ضروری ہے تو وہ اس عورت کا معصوم بچہ ہے۔ جو اس وقت جھولے میں پڑا ہوا تھا اور اس وقت اپنے باپ کی گود میں ہے۔ اس پر تمام حاضرین حیران ہو گئے اور قاضی یوں کہنے لگا کہ ''اے انسان کیا کبھی دودھ پیتے بچے نے بھی کلام کیا ہے؟ اس پر قلندر لعل شہباز نے کہا کہ اس عورت نے مجھ بے گناہ پر یہ شرمناک الزام لگایا ہے۔ اس وقت اس کا معصوم بچہ جھولے میں جھول رہا تھا۔ اس بچے سے وہی کلام کرائے گا جس نے ایام طفلی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کرایا تھا۔ قاضی نے بچے کے باپ کو بچے کو ان کے سامنے لانے کا حکم دیا۔ جب بچہ حاضر ہوا تو قلندر شہباز نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا: کہ اے معصوم وہ خالق اکبر جس نے ایام طفولیت میں حضرت عیسیٰ کو بات کرنے کی طاقت بخشی تھی۔ تم اس اللہ کو حاضر و ناظر جان کر گواہی دو کہ میں جس وقت تمہارے گھر میں بیٹھا تھا تو اس وقت تم نے اپنا انگوٹھا چوستے ہوئے اپنی آنکھوں سے کیا دیکھا اور ہماری کیا گفتگو سنی؟ سبحان اللہ! حمد و ثناء کے لائق وہی اللہ تعالیٰ ہے جس نے ہمیں پیدا کر کے بات کرنے کی توفیق بخشی ہے۔ اور کچھ زبانوں کو گونگا بھی کیا ہے تاکہ ہمیں اس سے عبرت حاصل ہو۔ سچ کہنے والوں کا ساتھی اور جھوٹوں کا دشمن ہے۔ وہ بچہ اپنے باپ کی گود میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور اونچی آواز میں کہنے لگا کہ یہ شخص جو کہہ رہا ہے وہ سچ ہے۔ قصور میری ماں کا ہے جس نے بدارادہ سے اس کا دامن پکڑا تھا۔

لوگ یہ کرامت دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے اور قاضی صاحب نے قلندر شہباز کے ہاتھ چوم کر اپنے ساتھ مسند پر بٹھایا وہ عورت بھی ہمیشہ کیلئے تائب ہو گئی۔ اس کے بعد شہریوں کا ایک وفد جنگل میں گیا اور آپ کا مال و اسباب اٹھا کر جلوس کی صورت میں شہر آیا۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اس وقت شہزادہ محمد شہید ملتان کا گورنر تھا۔ جو بزرگان دین کا بڑا معتقد تھا۔ اس نے جب قلندر شہباز کے اس معجزے کا حال سنا تو وہ آپ سے بڑا متاثر ہوا اور قلندر شہباز سے کچھ عرصے تک ملتان میں قیام کرنے کی گزارش کی۔ آپ اس کی عقیدت مندی دیکھ کر اس پر آمادہ ہو گئے۔

اخبار الاخیار میں اسی بات کو اس طرح پیش کیا گیا ہے۔ کہ قلندر شہباز شہزادہ محمد شہید کی درخواست پر کچھ دنوں تک وہاں رہے اور شہزادے کی صداقت کے بدلے میں اسے شہادت کا اعلیٰ اعزاز نصیب ہونے کی دعا دی۔ قلندر شہباز نے وہاں خلق خدا کو حد سے زیادہ فیض بخشا اور لاتعداد لوگ قلندر کی کرامات دیکھ کر ایمان لائے۔ آپ کی صحبت کے فیض سے علم کے طالب بڑے عالم اور روحانی تشنگی کے طالب کامل اولیاء بن گئے۔ شہزادہ آپ کی بہت خدمت کرتا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ قلندر شہباز کو ایک عظیم الشان خانقاہ بنوا کر دی جائے تاکہ وہ ہمیشہ کیلئے یہاں رہ جائیں۔ اس نے اپنی خواہش کا اظہار قلندر سے بھی کیا۔ جس پر آپ نے اپنے مقصد سے اسے آگاہ کیا اس وجہ سے وہ خاموش ہو گیا۔ آپ وہاں کافی عرصے تک قیام پذیر رہے۔ ملتان کی تاریخ میں یوں تحریر ہے کہ اس کے ایک لاکھ گاؤں اسماعیلی عرب امیروں کے ماتحت تھے۔ غازی محمد بن قاسم نے جو مسجد وہاں تعمیر کروائی تھی اور بنوامیہ کے دور کی یادگار تھی۔ اسے جعلم بن شیبان نے بند کروایا اور بت خانہ جو محمد بن قاسم کے زمانے میں موجود تھا اور عربوں کی اس سے بڑی آمدنی ہوتی تھی۔ جعلم بن شیبان نے اسے مسمار کروا کر وہاں ایک جامع مسجد تعمیر کروائی اور اس میں اسماعیلی خطبہ جاری کیا۔ یعنی امام جعفر صادق کے فرزند اسماعیل اور اس کے خاندان کی امامت کی تبلیغ جاری کی۔ نہ صرف یہ بلکہ اسماعیلیوں نے بہت سے لوگوں کو اپنا داعی بنا کر برصغیر کے اندرونی مقامات پر بھیج کر وہاں اسماعیلی امامت کی تبلیغ جاری کی۔ ان میں حسن بن صبا ایک مشہور و معروف داعی تھا۔

کتابوں میں مرقوم ہے کہ ملتان میں قیام کے دوران قلندر شہباز کی بہت سے علماء

مشائخ اور درویشوں سے ملاقات ہوئی اور ان کا متفق قول ہے کہ اس وقت شیر شاہ جلال سرخ پوش، بابا شیخ فرید اور غوث بہاو الدین زکریا آپ کے ہم عصر اور دوستوں میں سے تھے۔ آپ نے اکثر ان کے ساتھ سیر و سیاحت کی۔

مذکورہ چاروں بزرگان دین کی یہ کہانی بھی مشہور ہے کہ ایک مرتبہ غوث بہاؤ الدین پر کسی نے جھوٹا الزام لگایا اور وہاں کے قاضی کے فتویٰ سے انہیں پھانسی دی جا رہی تھی جب انہیں تختہ دار کی طرف لے جایا گیا تو باقی تین بزرگوں نے اپنی اپنی طاقت کے مطابق اپنا روپ تبدیل کیا۔ بابا شیخ فریدالدین ہرن کی صورت اختیار کر کے پھانسی دینے کی جگہ پر کھڑے ہوئے لوگوں کے ہجوم میں گھس گئے اور سید شیر شاہ جلال شیر بن کر اس کے پیچھے دوڑے۔ لوگوں نے جب یہ منظر دیکھا تو ڈر کر بھاگ کھڑے ہوئے اور قلندر شہباز باز بن کر غوث بہاؤ الدین کو پھانسی کے تختے سے اڑا کر لے گئے۔

قلندر شہباز کو بچپن سے ہی علم حاصل کرنے کا از حد شوق تھا اور سات سال کی عمر میں انہوں نے کلام مجید حفظ کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ تھوڑے ہی عرصہ میں عربی اور فارسی میں بھی مہارت حاصل کر لی تھی۔ ان کی عربی کی مہارت کے سلسلے میں مندرجہ ذیل واقعہ سے ثبوت مل سکتا ہے۔

حضرت قلندر شہباز جب ملتان میں تشریف لائے تو اس زمانہ میں سلطان محمد ابن غیاث الدین بلبن حکمران تھا۔ وہ عارفوں اور عاملوں کا بہت قدر دان تھا۔ جب اس نے قلندر شہباز کی آمد سنی تو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، تعلیم بجالایا اور تحفہ تحائف دینے کے بعد آپ سے ملتان میں قیام کی درخواست کی لیکن آپ نے یہ دعوت قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ اسی دوران قیام سلطان محمد نے ایک عربی سرود کی مجلس کا اہتمام کیا۔ اس مجلس میں حضرت غوث بہاؤ الدین زکریا ملتانی کے فرزند حضرت صدرالدین عارف ملتانی بھی موجود تھے اور یہ دونوں بزرگ (یعنی قلندر شہباز و عارف ملتانی) عالم وجد میں رقص کرنے لگے اور خود سلطان محمد کا یہی عالم تھا۔"

اس واقعہ سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ عربی کے ماہر تھے۔ جو سرود کی روح پر پہنچ گئے۔ فارسی میں آپ کی دسترس تو ان اشعار سے عیاں ہو جاتی ہے جو آپ نے کہے ہیں۔

مشہور انگریز محقق برٹن جو کہ علوم شرقیہ' لسانیات اور گرائمر کا ماہر متصور کیا جاتا ہے' اپنی تصنیف میں رقمطراز ہے کہ اس وقت مکتب میں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ ان میں قلندر شہباز کی یہ کتب بھی شامل ہیں۔ ۱۔ عقد ۲۔ قسم دوئیم ۳۔ اجناس ۴۔ میزان صرف۔

آپ نے کچھ' گرنار اور گجرات کی بھی سیر و سفر کیا۔ جونا گڑھ بھی گئے جہاں آپ کی ملاقات ایک درویش سے ہوئی۔ ہندوستان میں ''بوعلی قلندر'' سے بھی آپ کی ملاقات ہوئی۔ روایت یہ بھی ہے کہ ''آپ جب بوعلی قلندر سے ملے تو انہوں نے فرمایا کہ ہندوستان میں تین سو قلندر موجود ہیں' بہتر ہے کہ تم سندھ جاؤ۔ چنانچہ آپ ان کے مشورے پر سندھ آئے۔''

بوعلی قلندر سے آپ کی ملاقات تاریخی لحاظ سے ممکن تو ہے لیکن یہ مشورے والی بات درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ آپ اپنے مرشدؒ کے حکم سے سندھ گئے تو پھر یہاں مشورے کی ضرورت پیش آنا قرینِ قیاس نہیں ہے اور یہی وجہ تھی کہ آپ نے شہزادہ محمد کی ملتان میں رہنے کی پیشکش قبول نہیں کی تھی۔

ایک روایت کے مطابق آپ گرنار بھی گئے تھے اور وہاں سے یہ بات منسوب ہے کہ جب آپ وہاں گئے تو ایک عورت آپ کے پاس آئی اور عرض کیا کہ اس کا بیٹا گم ہو گیا ہے۔ آپ اسے تلاش کر دیں۔ آپ ایک خانقاہ میں گئے جہاں سات ہندو فقیر رہتے تھے وہاں سے آپ لڑکے کو نکال لائے۔ یہ لڑکا بھی آپ کی نظر فیض اثر سے درویش ہو گیا۔ الغرض آپ نے سندھ اور ہند کے بہت سے شہروں کی سیاحت کی۔

سیہون آمد اور یہاں کے حالات

قلندر نامہ کا دعویٰ ہے کہ آپ سیہون میں سنہ ۶۴۹ھ میں تشریف لائے اور اس ضمن میں مصنف نے ایک فارسی شعر سے تاریخ نکالی ہے جو اس طرح ہے:

چوں باز آشیاں قدس شہباز　　سیدوستاں رانمودہ جنت آسا

خود تاریخ آل ازروئی اخلاص　　نمود آفتاب دین گفتا!

(اخلاص کے پہلے حرف الف کے عدد آخری مصرعہ کے عدد سے جمع کئے جائیں گے سنہ ۶۴۹ھ برآمد ہوگا)

تحفۃ الکرام کی روایت ہے کہ آپ نے غوث بہاؤ الدین زکریا ملتانی اور ان کے فرزند صدر الدین عارف کے ساتھ سیر و سفر کرتے ہوئے ٹھٹھہ کے قریب پیر پٹھ سے ملاقات کی۔ چونکہ پیر پٹھ نے سنہ ۶۴۲ھ میں وفات کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اس سے بھی پہلے سندھ میں وارد ہوئے۔ سیر و سفر کرنے کے بعد سنہ ۶۴۹ھ میں سیہون میں آکر قیام کیا۔

روایت ہے کہ سیہون میں آنے سے قبل قلندر شہباز نے لکی میں شاہ صدر الدین سے ملاقات کی اور ان سے کہا کہ آپ کی اولاد میں سے ایک بیٹا میرے ساتھ دیجئے تاکہ وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہے۔

چنانچہ شاہ صدرالدین نے اپنا پوتا شاہ صلاح الدین ان کی خدمت میں دے دیا۔ سید صلاح الدین کو ہی قلندر شہباز کے دربار کی سجادہ نشینی نصیب ہوئی۔

ایک دوسری روایت ہے کہ آپ اپنے تینوں احباب غوث بہاؤالدین زکریا' سید جلال بخاری اور خواجہ فرید الدین رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ شاہ صدرالدین سے ملے تھے۔ بہرحال سیہون میں آنے سے قبل صدرالدین سے ملاقات ضرور ہوئی تھی۔

سیہون میں جب آئے تو آپ نے اسی جگہ قیام کیا جو آج آپ کی درگاہ ہے اس وقت یہ ہندو فاحشہ عورتوں کی آماجگاہ تھی۔ آپ جس روز آئے اس روز جو بھی ان فاحشہ عورتوں کے پاس آیا وہ اپنے مطلب میں قادر نہ ہوا۔ سب نے ایک دوسرے سے پوچھا اور حیران ہوئے کہ آخر کیا ماجرا ہے۔ ہوتے ہوتے لوگوں کو یہ معلوم ہوگیا کہ "ولی اللہ" آ گئے ہیں۔ اس کا اتنا اثر ہوا کہ عورتیں اور مرد آپ کے قدموں میں گر گئے اور سچے دل سے توبہ کر کے آپ کے فیض سے مستفیض ہونے لگے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ آپ کے آنے سے قبل اس علاقے کی سرسبزی و شادابی میں کمی ہوگئی تھی لیکن آپ کی آمد سے یہ علاقہ پھر سرسبز و شاداب ہوگیا۔

حضرت قلندر شہباز جب سندھ میں تشریف لائے تو سندھ میں سومرہ خاندان کی حکومت تھی۔ یہ ایک قدیم قوم ہے جس نے سندھ پر بڑے طویل عرصہ تک حکومت کی۔ لیکن ان کی تاریخ پر تاریکی کے اتنے پردے پڑے ہوئے ہیں جن کی شاید ہی کوئی مثال کسی ملک یا قوم کی تاریخ میں ملتی ہو' کسی بھی قدیم تاریخ میں ان کا مفصل احوال نہیں آیا ہے۔ تاریخ معصومی' فرشتہ' تحفۃ الکرام' تاریخ طاہری اور منتخب التواریخ میں مندرجہ بیان بہت مختصر ہے۔ اس کے علاوہ سومرہ حکمرانوں کے جو نام اور ان کی حکومتوں کے جو عرصے دیئے گئے ہیں ان میں بھی اختلاف ہے۔ حضرت قلندر شہباز کی سندھ میں آمد ۶۴۹ھ میں ہوئی۔ اس زمانے میں مختلف تاریخوں میں مختلف بادشاہ دکھائے گئے ہیں۔ ذیل میں ان کی تفصیل دی جاتی ہے۔

نام تاریخ	نام بادشاہ	سن وفات	بادشاہ نمبر
تاریخ معصومی			
تحفۃ الکرام	محمد طور	۶۴۳ھ	
دولت علویہ	شمس الدین بھونگر	۶۷۸ھ	۱۴
منتخب التواریخ	محمد طور محمدی ٹیشنی کاسن	۶۳۲ھ	

دولت علویہ اتنی معتبر کتاب نہیں ہے اور محققین کے نزدیک اس کی حیثیت ناول اور افسانے سے زیادہ نہیں ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں محمد طور سندھ کے سلطان تھے۔

سومرہ قوم کی حکومت بھی کوئی مستقل حکومت نہیں تھی اور نہ ہی سارے سندھ پر ان کی حکومت تھی۔ بالکل شروع کے زمانے میں وہ سندھ کے بہت تھوڑے حصہ پر قابض تھے۔ اس کے بعد وہ پھیلتے چلے گئے۔ اس کے علاوہ پہلے وہ سلاطین دہلی کے ماتحت بھی تھے۔ صاحب تحفۃ الکرام نے لکھا ہے۔ ''مخفی نہ ہو کہ سومرہ قوم درحقیقت دو سال پہلے سندھ کے کچھ حصہ پر غالب تھی لیکن وہ مسلمان سلاطین کے ماتحت تھے۔ اس لئے ان کا علیحدہ ذکر نہیں کیا گیا ہے۔''

اس قوم کی باقاعدہ حکومت سلطان محمود کے فرزند عبدالرشید کے زمانے میں شروع ہوئی۔ عبدالرشید ایک سادہ مزاج کم عقل اور عیاش شخص تھا اس لئے ماتحت حکام نے سرکشی شروع کی اور فرمانبرداری سے نکل گئے۔ اس زمانہ میں اس قوم نے ''سومرہ'' نامی اپنے ایک سردار کو ''تھوڑی'' ہی میں جمع ہو کر تخت نشین کیا اور اپنا بادشاہ ظاہر کیا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے وہ غزنوی خاندان کے باجگذار تھے۔ ان کے کمزور ہونے کے بعد وہ خودمختار ہو گئے۔ اس کے بعد پھر وہ دہلی کے سلاطین کے ماتحت ہو گئے لیکن درمیان میں کبھی کبھی بغاوت کر کے خودمختار بھی ہو جاتے تھے۔

ہندوستان کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچویں صدی ہجری میں

غوری سلاطین کا تسلط تھا۔ چھٹی صدی ہجری میں ناصرالدین قباچہ نے ''اوچ'' کو اپنا دارالحکومت بنا کر بالائی سندھ پر حکومت کرنی شروع کی تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۶۲۳ھ میں سیوستان (سیہون) کے علاقہ پر ملک خان خلجی کا قبضہ تھا۔ یہ التمش کا طرفدار تھا۔ اس وجہ سے قباچہ سے اس کا مقابلہ ہوا جس میں ملک خان کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا۔ ۶۲۴ھ میں التمش نے اپنے وزیر نظام الملک محمد بن ابی سعد کو سندھ کا گورنر مقرر کیا اور قباچہ کو زیر کرنے کیلئے روانہ کیا۔ قباچہ کو شکست ہوئی اور ۱۹ جمادی الآخر ۶۲۵ھ ہفتہ کی رات کو بھکر کے پاس سندھو دریا میں ڈوب کر مر گیا۔ اس کے بعد نظام الملک سندھ کا حاکم رہا۔ صاحب تاریخ معصومی نے لکھا ہے کہ اس نے سندھ کا انتظام بہت اچھا رکھا۔ شہروں کی آبادی اور رعیت کے آرام کیلئے بہت کوشش اور محنت کی۔ کچھ عرصہ بعد نورالدین محمد کو سندھ کا انتظام سپرد کر کے خود دہلی چلا گیا۔

نظام الملک نے نہ صرف بالائی سندھ پر قبضہ کیا بلکہ سندھ کے حصہ زیرین پر حملہ کر کے سومروں کو بھی زیر کیا۔ صاحب طبقات ناصری نے لکھا ہے ''قباچہ کے مرنے کے بعد' سمندر کے کنارے تک حکومت بڑھی اور دیبل (ریپل بندر) اور سندھ کے والی ملک سنان الدین چنسیر بھی التمش کے تابع ہوا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سومروں کی حکومت سندھ کے حصہ زیرین پر تھی۔ سیہون پر ان کی حکومت نہیں تھی۔ تحفۃ الکرام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں نہ صرف بھکر' سیہون اور حصہ زیرین پر علیحدہ علیحدہ حکومتیں تھیں بلکہ دوسری بھی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں اور وہ حکومت ملتان کے ماتحت تھیں۔ میر علی شیر قانع نے تحفۃ الکرام میں لکھا ہے کہ ''اوچ اور سندھ پر ناصرالدین قباچہ کا فرمان جاری ہونے لگا۔'' اس زمانے میں سرزمین سندھ پر مندرجہ ذیل ریاستیں تھیں جو حکومت ملتان کے ماتحت تھیں۔

۱۔ رانہ سہتہ (بھونر) راٹھور۔ ریاست ڈھبڑو (تعلقہ دربیلہ)

۲۔ رانہ سنر بن دہاچ' کوریچہ سمہ' ساکن تو نگ' جوروپاہ کے حدود میں تھا۔

۳- جیسر ین ججہ اججہ' ماچھی سولنگی' ساکن مانگنارو۔

۴- وکیو بن پنہوں چنہ' ساکن درہ سیوٹی۔

۵- چنو بن ڈہڑ (ڈیتھو)' چنہ ساکن بھاگ نئی (ناڑی)

۶- جیو بن دریا' ساکن جھم یعنی ہمیہ کوٹ۔

۷- جسودھن آ گرڈ ساکن مین ٹکر تعلقہ بھانبھرواہ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت قلندر شہباز کی آمد سے کچھ پہلے' قباچہ اور التمش کے زمانہ میں' سندھ بہت سے حصوں میں تقسیم تھا اور ان پر علیحدہ علیحدہ راجہ اور سلاطین قابض تھے۔ سومروں کے شروع کے زمانے میں ایک حصہ پر مشہور ظالم راجہ دلورائے بھی قابض تھا۔ اس کے دارالحکومت اروڑ اور برہمن آباد تھا۔ اس زمانہ میں منصورہ میں ابھی تک عرب ریاست قائم تھی۔ وہاں بڑے بڑے علماء رہتے تھے جو سندھ کے مختلف حصوں میں تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیتے تھے۔ ان کی کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ دوسرے آدمیوں کے ساتھ خود دلورائے کا چھوٹا بھائی چھٹہ امرانی بھی مسلمان ہو گیا جو اس وقت چھوٹی عمر کا تھا۔ اسلام قبول کرنے کی وجہ سے اس کو اپنے بھائی کے مظالم کا شکار ہونا پڑا۔ آخر تنگ آ کر خلیفۃ المسلمین کے پاس شکایت لے گیا۔ وہاں سے دلورائے کو زیر کرنے کیلئے اور اسلام کی تبلیغ کا کام سرانجام دینے کیلئے سید علی مکی کو ایک فوجی دستہ کے ساتھ سندھ میں لائے۔ آپ کے آنے کے بعد دلورائے تائب ہو کر مسلمان ہوا اور اپنی دختر سید صاحب کے نکاح میں دی۔ سید صاحب کے اس سے چار فرزند ہوئے جن کے نام یہ ہیں۔ ۱۔ سید محمد ۲۔ سید مراد یو ۳۔ سید حاجی عرف بھرکیہ ۴۔ سید چنگو۔ تحفۃ الکرام کی روایت ہے کہ شاہ صدر لکیار' سید محمد کے فرزند تھے۔ حضرت قلندر شہباز جب پہلے آئے تھے تو سب سے پہلے آپ کی ملاقات حضرت شاہ صدر سے ہوئی تھی۔

عوام میں مشہور ہے کہ حضرت قلندر شہباز کی آمد کے زمانہ میں سیہون پر ظالم ہندو راجہ راج کرتا تھا جس کا نام جسپر اور لقب ''چربٹ'' تھا۔ اس راجہ کے متعلق سندھ میں

ایک مثل مشہور ہے ''اندھیر نگری چر بٹ راجہ، ٹکے سیر بھا.جی ٹکے سیر کھاجا'' (یعنی چر بٹ راجہ کی وجہ سے علاقہ میں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ اس اندھیرے کا یہ عالم ہے کہ دو پیسے میں سبزی کا بھی ایک سیر ملتا ہے اور دو پیسہ میں کھاجا (خشک میوہ) کا بھی ایک سیر ملتا ہے۔ اس راجہ کی بیوقوفی اور ظلم کے بہت سے قصے آج تک مشہور ہیں۔

تاریخوں میں ہمیں سیوستان کے حاکم کا نام نہیں ملتا۔ روایت سے صرف ایک ظالم اور بیوقوف ہندو راجہ کی حکومت کا پتہ چلتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکمران قتلغ خان کی آمد سے قبل مذکورہ ہندو راجہ حکومت کرتا ہوگا جس کو سلطان ناصرالدین نے شکست دے کر ۶۴۹ھ میں قتلغ خان کو سیوستان کا حاکم مقرر کیا۔ یہ بھی حضرت قلندر شہباز کی آمد کی ایک برکت تھی کہ آپ کے آنے سے ایک ظالم راجہ کا خاتمہ ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت قلندر شہباز کے آنے کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں راجہ کا خاتمہ ہو گیا کیونکہ قتلغ خان بھی اسی سال سیہون کا حاکم مقرر رہوا۔

سلطان ناصرالدین بہت ہی نیک اور متقی سلطان تھا۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ قرآن شریف کی کتابت کر کے اس کی آمدنی سے گزارہ کرتا تھا۔ اس کا سیہون پر خاص طور پر حملہ کرنا ظاہر کرتا ہے کہ وہاں کا حاکم ظالم تھا اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا آنا حضرت قلندر شہباز کے باطنی اشارہ کے مطابق ہوگا۔

اس زمانہ میں سیہون نہ صرف علاقہ سیوستان کا خاص شہر تھا بلکہ سندھ میں سب سے بڑا اور نہایت ہی اہم شہر تھا۔ دستور ہے کہ جب بڑے شہروں میں خرابی پیدا ہوتی ہے تو اس کا اثر تمام شہروں اور دیہاتوں پر پڑتا ہے۔ سیہون سندھ کا ایک بہت بڑا اور نہایت ہی اہم شہر تھا اور وہ خرابی میں انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اسی وجہ سے حضرت قلندر شہباز نے اسی کو اپنا مسکن بنایا کیونکہ آپ کا مقصد خرابی کو دور کرنا تھا۔

اقوالِ طریقت قلندری

شہباز قلندر کے فرمودات طریقت کے طالبوں کیلئے آب حیات کا درجہ رکھتے ہیں۔ آپ کے اشعار، گفتگو، مجلسی تذکروں اور بعض کتب سے جو روح پرور، بصیرت افروز اور باکمال اقوال ہمیں میسر آ سکے ان کا بڑا حصہ آپ کے فقراء سے حاصل کیا گیا ہے۔ یہ اقوال آپ کی طریقت کو واضح کرنے میں زبردست مدد دیتے ہیں چند اقوال پیش خدمت ہیں۔

اشھد اللہ انہ و ملائکۃ واولی العلم قائماً بالقسط

اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ میری ذات پاک ہے اور فرشتے اور اہل علم بھی انصاف کرتے ہیں اور گواہی دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔

بعد ازاں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف ہے کہ:

لولا لما خلقت الا فلاک وما محمد الا رسول

تحقیق محمد اللہ تعالیٰ کا نبی اور رسول ہے اور اگر اس کو نہ پیدا کیا ہوتا تو دنیا بھی وجود میں نہ آتی۔

اس کے بعد شیر خدا، سخی، شجاع، حضرت علی کی تعریف ہے جو فقیر کا بانی، نبی کا پیارا اور پردہ پوش اور صاحب ستر ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

من عرف نفسہ فقد عرف ربہ بالبقا

یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچانا، اس نے اپنے رب کا قرب حاصل کیا اور جس

نے اس کو فنا کیا تو جیسے اس نے بقا حاصل کی۔

جو شخص اللہ تعالیٰ سے غافل ہے وہ کافر پوشیدہ ہے اور اس حالت میں اس کے ہر سانس میں کوئی جان نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں یعنی جو شخص وقت مقررہ پر اپنا فرض ادا نہیں کرتا اس کی کوئی بھی عبادت قبول نہیں ہوتی۔

فقرا ہمیشہ علوم وفنون اور قبر وغیرہ کے مسائل سے الگ تھلگ رہ کر اللہ تعالیٰ کے ذوق وشوق اور اس کے ذکر میں مشغول رہتے ہیں اور یہی چیز قبر میں بھی ان کے ساتھ رفیق بن کر جاتی ہے۔ علم تو ابلیس کو بھی زیادہ تھا اگر علم سے اللہ تعالیٰ کا وصل حاصل ہوتا تو ابلیس عتاب کا شکار ہو کر ہرگز درگاہ الٰہی سے نہ نکالا جاتا۔ قول ہے کہ العلم وحجاب اللہ الاکبر یعنی علم اللہ تعالیٰ کے درمیان حجاب ہے۔ چنانچہ فقراء ذات ذوالجلال پر توکل کرتے ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ نی دنیا اور آخرت تمہارے لئے ہیں۔ اکثر علماء مراقبہ کا اس طرح ڈھونگ رچاتے ہیں جس طرح بلی چوہوں کے شکار کیلئے کرتی ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ ومکرو ومکر اللہ واللہ خیر الماکرین یعنی وہ اللہ تعالیٰ سے بھی دھوکہ کرتے ہیں۔

العلم نکتہ وکثرتھا الجھال یعنی علم حقیقی ایک راز ہے اور باقی علوم جہلاء کیلئے ہیں۔ علم صرف ونحو خوانی یا علم فقہ ایک اصول جہل ہے اور یہ غفلت خدا سے دور کرنے والی ہے۔ سوا عبادت الٰہی کے باقی سب غفلت ہے۔

ترک الدنیا رائس کل عبادتہ وحب الدنیا رائس۔ کل خطیتہ یعنی ترک دنیا عبادت کا اصل اور حب الدنیا گناہوں کی جڑ ہے' فقراء تارک الدنیا ہیں۔ دنیا کی محبت اور چاہت کیلئے سرور کائنات' فخر موجودات فرماتے ہیں الدنیا ومافیہا ملعون الا ذکر اللہ یعنی سوائے ذکر الٰہی کے دنیا کی ہر چیز ملعون ہے۔ دوسری جگہ آپ فرماتے ہیں طلب الدنیا مونث طلب العقبی مخنث طالب المولیٰ

مذکر

فقیر دنیا ومافیہا کو دیکھتا ہے لیکن ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا جیسے کہ سرور کائنات فخر موجودات نے معراج کی رات تمام عالم کی سیر کی لیکن بجز ذکر الٰہی کے اور کوئی خیال نہ کیا۔ فقیر کے حق میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اللھم امین مسکینا و امتنی مسکینا و حشرنی فی زمرته المساکین یعنی اے پروردگار مجھے مسکین رکھ میری موت مساکین جیسی ہو اور میں یوم قیامت کو بھی ان کے ساتھ ہوں۔

ریا کفر سے بھی بدتر ہے۔ کفر آگ کی طرف لے جانے والا اور ریا شکوک و شبہات میں ڈالنے والا ہے اور بہت سی چیز انسان کی دشمن ہیں۔

فقیر سوا اپنے رب کے اور کسی کا محتاج نہیں ہوتا الفقر لایحتاج الا اللہ و کل شی وما یحتاج الیه یعنی فقیر اللہ کے سوا اور کسی کا محتاج نہیں بلکہ ہر چیز اس کی محتاج ہے۔

تکلیف وارد ہو تو چاہئے کہ قرآن مجید کی تلاوت کرے۔ اہل بیت عظام سے دعا اور اہل قبر اولیاء اللہ سے مدد طلب کرے۔ انا تحیرتم فی الا...... ورفا ستعینو من اهل القبور یعنی اگر تم پریشان ہو جاؤ تو اولیاء اللہ سے مدد حاصل کرو۔

خلق داند زیر خاکش در قبر
در قبر قرب خدا شد سر بسر
بے خلل خلوت قبر یا رب جلیس
درمیانش کس نہ گنجد حق انیس

اولیاء اللہ زندہ ہیں یعنی اولیاء اللہ مرتے نہیں صرف ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتے ہیں اس آیت سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے۔ الا ان اولیـــاء اللہ لاخــوف علیهم ولا هم یحزنون. لاریب اولیاء اللہ کو موت سے ہرگز خوف نہیں ہوتا۔

کنت کـنـزا مـخـفـی فاجبت عن اعلاف فخلقت الحق یعنی اللہ تعالیٰ ایک مخفی خزانہ تھا جس نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ فقر

بھی ظاہر کیا۔ و نحن اقرب الیه من حبل الورید یعنی اللہ تعالیٰ انسانوں سے شہ رگ سے قریب تر ہے۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

و فی انفسکم افلا تبصرون

یعنی میں تمہارے وجود میں موجود ہوں لیکن تم دیکھ نہیں پاتے یعنی وہ دیکھنے سے بالاتر ہے۔

خدا تعالیٰ فرماتا ہے فاذ کرونی اذ کرکم والشکر ولی ولا تکفرون یعنی تم مجھے یاد کرو تو میں تمہیں یاد کروں گا۔ دوسری جگہ فرماتا ہے فقر و الی اللہ تعل اللہ فارق النفس یعنی اپنے نفس (نفسانی خواہشات ترک کر کے خدا کی طرف آ ؤ کیونکہ ایسے لوگوں کو ہی اپنایا کرتا ہے۔

نفس پانچ ہیں پہلا نفس امارہ یعنی کفر سے محبت اور فقراء سے دشمنی۔ دوسرا نفس لوامہ یعنی خلق سے نفاق (نفرت) اور منافقوں سے دوستی۔ تیسرا نفس ملہمہ یعنی کھانے پینے کی طرف رغبت اور ظلم و ستم کی طرف حرکت۔ چوتھا نفس نیک پرست، یعنی علوم شرع پر قائم عالم فقراء سے محبت اور پانچواں نفس مطمنہ۔ یہ نفس اولیاء اللہ کا ہوتا ہے۔

درحقیقت نفس چار ہیں لیکن اولیاء اللہ کے نفس کے ساتھ جملہ پانچ ہوتے ہیں۔

یا ایتها النفس المطمنته الرجعی الی ربک راضیة مرضیة فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی

یعنی اے نفس مطمئنہ اپنے رب کی طرف جلد آ ؤ۔ اللہ تعالیٰ تم سے خوش ہے اور تم اس سے خوش رہو گے اور پہلے تم میری عبادت میں اور اس کے بعد میری جنت میں داخل ہو جاؤ۔

بادشاہ اور وزیر تین ہیں۔ پہلا بادشاہ روح اور عقل اس کا وزیر ہے۔ دوسرا بادشاہ دل اور زبان اس کی وزیر ہے اور تیسرا بادشاہ نفس اور شیطان اس کا وزیر ہے۔

قرآن مجید، دل مومن، زبان مسلمان، نفس کافر اور پاؤں مسافر ہے۔

فقر کے پندرہ مقام ہیں۔ پہلا مقام توبہ کرنا' دوسرا ترک الدنیا' تیسرا جہل سے دور رہنا' چوتھا تکبر نہ کرنا' پانچواں صبر' چھٹا زہد' ساتواں قناعت' آٹھواں تسلیم' نواں توکل' دسواں رضائے الٰہی پر رہنا' گیارھواں شکر' بارھواں فکر' تیرھواں دل میں تصور کرنا' چودھواں محبت اور دل میں درد رکھنا پندرھواں حفظ مراتب کرنا ہے۔

چونکہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک' یاسین ہے لہٰذا چادر کا نام مدثر مقرر ہوا۔ اس کو رب العزت کے حکم سے جبرائیل امین دوسرے فرشتوں کے ساتھ لائے تھے اس کے درمیان میں یہ تحریر تھا۔

انـمـا يريد الله ليذهب عنكم الرجس اهل البيت و يطهركم تطهيرا اور اس کے چار کونوں سے پہلے کونے پر انا مـحـمـد الرسول الله صلى الله عليه وآله وسلم دوسرے کونے پر اخـى رسول الله على المرتضى تیسرے کونے پر ابى رسول الله حـضـرت فـاطـمة الزهرا اور چوتھے کونے پر جدی رسول اللہ حضرت امام حسن و حسین تحریر تھا۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ ان فى الـجـنته فهوا من لبن لعنى وزهرى وحسن وحسين كل من كان محبا نهم بدخل الجنتة من غرقين یعنی تحقیق علیؓ زہراؓ حسن اور محبان اہل بیت کیلئے بہشت میں ایک دودھ کی نہر ہے جس سے وہ سیراب ہوں گے اور فتنہ انگیز ہرگز بہشت میں داخل نہ ہوں گے۔

خطبہ شریعت عبادت اللہ تعالیٰ ذوالجلال والاکرام ہے۔ خطبہ طریقت صفت اہل بیت اور قرب کلام اللہ ہے۔ خطبہ حقیقت ہر حال لازوال یاحی یا قیوم برچشم حضرت محمد الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے اور خطبہ معرفت صفت ثناء دنیا فنا اور بقا باللہ ہے۔

رکن شریعت صدق اور اقرار زبان ہے رکن طریقت صدق و صادق اور اقرار زبان ہے۔ رکن حقیقت اپنی روح سے حرص و ہوس کو دور کرنا ہے اور رکن معرفت دل کے صدق سے اقرار روح ہے۔

فضل دعا سورہ فاتحہ ہے' افضل ذکر کلمہ طیبہ ہے۔ لذت ذکر ایمان ہے اور فقیر کی بزرگی صدق و صادق اور اس کا مقام دل اور روح کے مابین ہے۔

جسم شریعت میں' دل طریقت میں اور روح حقیقت میں آباد رہتی ہے۔ نفس معرفت پر مقرر ہے جب تک اسے فنا نہ کیا جائے گا۔ حقیقی حال حاصل نہیں ہوسکتا ہے۔

شریعت قول' طریقت فعل' حقیقت حال' معرفت اسرار الٰہی اور مہر و محبت محویت ہے۔ شریعت کشتی' طریقت دریا' حقیقت سیپ' معرفت موتی اور مہر و محبت' محنت یعنی تلاش کرنے والی چیز ہے۔

عقل فرشتہ' فہم غور وخوض اور شہوت حیوان ہے۔ عقل کا مقام عرش اور فہم اس کی کرسی ہے۔

روح پیر' وجود مرید' دل مرشد اور فہم طالب ہے۔

اوّل فقیر فنا' آخر فقیر بقا' جام فقیر عیب پوش' کلید فقیر رضا' گنج فقیر مسکینی' ذات فقیر خدائی فرائض کی ادائیگی خانہ فقیر قناعت' دین فقیر بیداری' مرکب فقیر استواری' سنت فقیر خود کو حقیر کرنا' تاج فقیر توکل' کمر بند فقیر خدمت خلق اور لقمہ فقیر غصے کو ضبط کرنا ہے۔

آٹھ مقام کیا ہیں؟

پہلا مقام تائباں جو حضرت آدم صفی اللہ کا ہے۔ دوسرا مقام شاکراں جو حضرت نوح نجی اللہ کا ہے' تیسرا مقام محبان' جو حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا ہے' چوتھا مقام راضیان جو حضرت اسماعیل ذبیح اللہ کا ہے' پانچواں مقام زاہداں جو حضرت عیسٰی روح اللہ کا ہے' چھٹا مقام صابراں حضرت ایوب کا ہے' ساتواں مقام عارفاں جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے اور آٹھواں مقام شہیداں جو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا ہے۔

تکیہ بنا کر رہنے سے فقراء کی خدمت' حیوانوں اور پرندوں کی تواضع اور مسافروں کی آسائش مقصود ہوتی ہے۔ اگر ایک فقیر کے مکان پر یہ چیزیں ظہور پذیر نہ ہوں تو اس کا تکیہ بنانا قطعاً ناجائز ہے۔

کلاہ کے چار حرف ہیں۔ ک سے مراد کریم ہونا' ل سے مراد حد سے زیادہ نفیس ہونا' الف سے مراد افتادگی' اور ہ سے مراد مرشد کامل سے ہدایت حاصل کرنا۔ جس شخص میں ان خوبیوں کا فقدان ہے اس کیلئے کلاہ اوڑھنا قطعی حرام ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ الحدقه صورت الفقر و کساة الفقراء و لباس الصلحا یعنی خرقہ فقیر کی صورت صالحین کا لباس اور اولیاء اللہ کی زینت ہے۔

لہٰذا ایک بہترین لباس ہے۔

خرقہ کے گریبان پر یا صبور یا شکور یا عزیز یا ستار یا لطیف یا حکیم لکھا ہوا ہوتا ہے۔

اس لئے خرقہ پوش فقیر پر لازم ہے کہ وہ ان اسماء الحسنٰی کا مفہوم سمجھ کر صبر' شکر' عیب پوشی' لطف' حلم اور دوسرے اوصاف اختیار کر کے کامل درجہ پر پہنچے۔

فقر را غم نیست رہبر پیش راہ است
کہ دلم دامن بر مصطفٰی است

یعنی فقیر کیلئے کوئی غم نہیں ہے اور جو رہبر راستے پر موجود ہے اس کے اوپر حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ ہے۔

انسان مرتا ہے تو اسے کفن پہنایا جاتا ہے۔ اسی طرح فقیر بھی جیسے جیتے جی دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے اس لئے وہ یہ لباس اختیار کرتا ہے اور اس کے پہنتے ہی وہ دنیاوی حرص و ہوس اور خواہشات سے ہمیشہ کیلئے بے تعلق ہو جاتا ہے۔

سوالات و جوابات کے علاوہ قلندر شہباز کے فقراء کی عصا تفصیل' کشا' قلابہ' کشکول' چھٹی' رومال' دست پناہ اور خرقہ۔ مطلب یہ ہے کہ ہر چیز کے متعلق لاتعداد سوالات و جوابات موجود ہیں جن کے اصول اور مقصد آیات قرآنی اور احادیث کی رو سے اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ ان اشیاء کا مفہوم اور مقصد فوراً ذہن نشین ہو جاتا ہے۔

وصال

آپ کے دریائے فیض سے بہت سے لوگ مستفیض ہوئے لیکن آپ کے خاص طالب عبداللہ شاہ ابدال، سکندر بودلو بہار، سید میر کلان سید علی سرمست اور عبدالوہاب تھے۔ جب آپ کے وصال کا وقت قریب ہوا تو اپنے طالبوں کو ہدایات دے کر مراقبہ میں بیٹھ گئے اور اسی حالت میں وصال فرمایا۔ آپ کو غسل دے کر وہیں دفن کیا گیا جہاں آپ نے سب سے پہلے تلیہ بنایا تھا۔ آپ کے غسل کی جگہ آپ کی درگاہ کے مغرب میں ہے۔ لب تاریخ سندھ کے مصنف نے ''برحمت'' سے تاریخ وصال نکالی ہے اور سن وفات ۶۵۱ھ (مطابق ۱۲۵۱ء اور تاریخ وصال ۲۱ شعبان دی ہے۔ دوسرے بہت سے لکھنے والوں نے بھی یہی سن وصال دیا ہے۔ اس سال کیلئے مندرجہ ذیل شعر مثال کے طور پر دیا جاتا ہے۔

بجو تاریخ شمس الدین عثمان	بدر کن ''رنج'' از ''فلک کرامت''
سن عمرش ''ولی اللہ'' وفاتش!	سروش غیب میگوید: برحمت

یعنی ۵۳۸ھ میں آپ کی ولادت ہوئی۔ ۱۱۲ سال آپ کی عمر تھی اور ۶۵۰ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ مقالات الشعراء میں میر علی شیر قانع نے سن وصال ۶۷۳ھ (مطابق ۱۲۷۴ء) دیا ہے اور تاریخ وصال منظوم کی ہے۔

میر قانع نے اپنی دوسری کتاب تحفۃ الکرام میں بھی یہی تاریخ دی ہے۔ شمس

العلماء مرزا قلیچ بیگ مرحوم نے اپنی کتاب ''قدیم سندھ'' میں بھی یہی سن وصال دیا۔ کچھ تاریخوں میں ۶۷۴ھ بھی آیا ہے۔ اگر آپ کا سن وصال ۶۵۰ قبول کیا جائے گا تو پھر سلطان محمد سے آپ کی ملاقات قبول نہیں کی جاسکتی کیونکہ پہلے آچکا ہے کہ سلطان محمد سے آپ کی ملاقات ۶۶۳ھ میں یا ۶۶ھ میں ہوئی۔ سلطان محمد سے آپ کی ملاقات کا ذکر مستند تاریخوں میں آیا ہے۔ اس لئے آپ کا سن وصال ۶۷۳ھ ہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ مذکور شعر میں سن وصال ۶۵۰ھ کے ساتھ ولا ت کا سن ۵۳۸ھ آیا ہے۔ وہ بھی صحیح معلوم نہیں ہوتا۔

حدیقتہ الاولیاء اور مآثر الکرام میں بھی سن وصال ۶۷۳ھ دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ایچھ اوسکار نگانی نے بھی ۶۷۳ھ کی تائید کی ہے۔ خزینتہ الاصفیاء کا سن ۶۷۴ھ بھی صحیح نہیں ہے اس کے تذکرہ نگار نے تو حضرت قلندر شہباز کے متعلق معتبر و مستند حالات بیان ہی نہیں کئے ہیں۔

ماہ شعبان میں ۱۸ سے ۲۰ تاریخ تک ہر سال آپ کی درگاہ پر عرس ہوتا ہے جس میں دور دراز سے لوگ آکر شریک ہوتے ہیں اور آپ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ عرس میں صرف سندھ ہی نہیں بلکہ مکران، پنجاب، بلوچستان، سرحد اور ایران کے لوگ بھی شریک ہوتے ہیں۔ اب تو حکومت کی طرف سے ادبی کانفرنس اور ثقافتی شو بھی ہونے لگے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اب یہاں ایک بڑا دارالعلوم اور کلچرل سنٹر قائم کیا جائے۔ اس کے علاوہ آپ پر تحقیقی کام کرنے والے افراد کی رہنمائی کیلئے بھی ایک حوالہ جاتی لائبریری ہو۔

آپ کی طریقت کا سلسلہ آپ کے طالبوں سکندر بودلہ بہار حضرت عبداللہ شاہ ابدال اور وزیر نینک تقدیر سید علی سرمست نے جاری رکھا۔

آپ کے وصال کے بعد بھی آپ کے فیض کا دریا اسی طرح رواں رہا بلکہ بقول آپ کے فقراء کے مرشد قلندر شہباز کے فیض کا دریا ان کی زندگی میں محدود تھا لیکن ان

کے وصال کے بعد وہ لامحدود ہو گیا اور اس نے پورے ملک کو اپنے فیض سے سیراب کیا اور سندھ و ہند کے بہت سے درویش آپ کی طریقت کی شمع سے اپنی شمع جلا کر عوام الناس کو روشن کرتے رہے۔

قلندر شہباز کی رحلت کی خبر پھیلتے ہی آپ کے مرید اور عقیدت مند ہزاروں کی تعداد میں سیہون میں آنے لگے اور قلیل عرصہ میں سیہون ایک عظیم زیارتی شہر بن گیا۔ بہت سے سالک آپ کی طریقت میں شامل ہونے کیلئے کئی برسوں تک وہاں قیام پذیر رہے ان میں سے کچھ آپ کے طالب حضرت سکندر بودلہ سے تلقین لے کر رخصت ہوتے تھے اور کچھ قلندر شہباز کے وزیر سید علی سرمست سے فقیرانہ بیعت کر کے اس کے حلقہ فقیری میں داخل ہوتے تھے اور قلندر شہباز کے مزار پر پھول اور غلاف وغیرہ چڑھانے کی خدمات بھی سید علی بجالاتے تھے۔

مروی ہے کہ جب سید علی سرمست کے طالب زیادہ ہونے لگے تو ان طالبوں نے اپنے علیحدہ تکیے مقرر کیے۔ سید عبدالوہاب نے محفل خانہ کے تکیہ کو آباد کیا جو محفل خانہ کافی کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے فقراء نے اسی کافی میں بودوباش اختیار کی۔

سید ابراہیم شاہ جتی جو ایک صاحب کرامت درویش ہو گزرے ہیں۔ ان کے فقراء ایک الگ تکیے میں رہتے تھے وہ ایک انتہائی کشادہ دل بزرگ تھے۔ انہوں نے قلندری طریقت کو خوب روشن کیا۔ وہ قلندری سنت کے اس قدر پابند تھے کہ بہت سے درویش آپ کے ہاتھ پر بیعت ہونے میں فخر محسوس کرتے ہوئے کئی کئی دنوں تک آپ کی خدمت میں بیٹھے رہتے تھے۔

مشہور ہے کہ ایک مرتبہ ایک حسین و جمیل نوجوان آپ کی محفل میں آیا۔ جب ابراہیم جتی نے قلندر شہباز کی فقیری کا تذکرہ کیا تو آپ کی گفتگو سے انتہائی طور پر متاثر ہو کر طالب ہونے کیلئے بے تاب ہو گیا۔ آپ نے اس کا شوق دیکھ کر اسے اپنا طالب بنالیا کچھ عرصے کے بعد اس کے عزیز وہاں آ نکلے اور اس کا یہ حال دیکھ کر حیران ہو گئے

اور حضرت ابراہیم شاہ جتی کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضور ہم اہل سادات ہیں اس نوجوان نے جس کا نام شاہ صلاح الدین ہے ابھی حال ہی میں شادی کی ہے لیکن آپ نے اسے بھی فقیر بنالیا۔ اس پر آپ نے جواب دیا کہ پہلے یہ کفار کی سنت پر امیر تھا۔ لیکن ہم نے اسے سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا فقیر بنا دیا ہے اگر اس کی شادی ہو چکی ہے تو ہم اسے صاحب اولاد بھی کیے دیتے ہیں۔ یہ آپ کی زبان مبارک کا ہی اثر ہے کہ وہ آج تک شاہ صلاح الدین اولادی کے نام سے اور اس کی کافی ''اولادی امیر کی کافی'' کے نام سے مشہور و معروف ہے۔

سید علی سرمست کی رحلت کے بعد قلندر شہباز کی ظاہری و باطنی خدمات آپ کی طریقت کے طالب پشت در پشت انجام دیتے رہے۔

مروی ہے کہ شاہ صلاح الدین اپنے مرشد کے حکم پر اپنے اہل و عیال کو بھی سیہون میں لے آئے۔ انہیں کافی اولاد ہوئی۔ سید ابراہیم شاہ جتی کے بعد قلندر شہباز کی ظاہری خدمات بھی وہی انجام دیتے رہے۔ کہتے ہیں کہ قلندر شہباز کی ان پر حد سے زیادہ کرم نوازی ہوئی تھی وہ دنیاوی مال و دولت اور جاہ و حشمت کو ترک کر کے ایک کامل فقیر بنے تھے۔ قلندر شہباز کی نظر کرم سے ان کی اولاد میں بہت سے اولیاء اللہ ہو گزرے ہیں۔

تاریخ تحفتہ الکرام میں تحریر ہے کہ سید صلاح الدین کے فرزند ارجمند سید پیر شاہ اپنے والد ماجد کے قائم مقام اور سجادہ نشین ہوئے۔ وہ ایک صاحب ریاضت انسان تھے اور ان کی ہر رات عبادت کرتے گزرتی تھی اور گرمی ہو یا جاڑہ نوافل کی ہر بارہ رکعت کے بعد وہ نیا غسل فرماتے تھے۔

اسی تاریخ میں آپ کے ایک فرزند سید نور شاہ کے متعلق تحریر ہے کہ اگرچہ ان کا ظاہری نمونہ لاپرواہ اور رندانہ تھا لیکن حقیقتاً وہ اس کمال درجہ پر پہنچے ہوئے تھے کہ ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ تقدیر بن جاتا تھا۔ آپ کے کثیر اخراجات دیکھ کر لوگ آپ کو کیمیا گر خیال کرتے تھے۔

اس خاندان کے کچھ سید اس وقت دادو کے ڈاؤچھ گاؤں میں رہتے ہیں ان کی ٹوٹی پھوٹی حویلیاں سیہون شہر میں موجود ہیں جو ان ہی کے نام سے یاد کی جاتی ہیں۔
مشہور ہے کہ ایک عرصہ دراز کے بعد جب صلاح الدین شاہ کی اولاد ختم ہو گئی تو اس کے بعد آپ کے طالب شیوخ' طالب بطالب قلندر شہباز کی ظاہری خدمات بجا لاتے رہے یہ بھی ایک لمبی مدت تک اس خدمت پر مامور رہے۔ ان میں سے شیخ بخند و شاہ' لعل جعفر شاہ' شیخ مکھن شاہ اور شیخ میاں ڈنل مشہور و معروف درویش ہو گزرے ہیں۔

تحفتہ الکرام میں لکھا ہے کہ ان شیوخ پر قلندر شہباز بہت مہربان تھے۔
کہتے ہیں کہ لکیاری سید نے جو اس شیخ خاندان کے نواسے تھے' قلندر شہباز کی درگاہ کی چابی حاصل کرنی چاہی۔ شیخ کسی طرح بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے لہٰذا انہوں نے خود چابی ان کے حوالے کر دی۔ چابی حاصل کرنے کے بعد اہل سادات نے درگاہ کا دروازہ کھولنا چاہا لیکن وہ کسی طرح بھی نہ کھل سکا۔ تالا توڑنے کیلئے لوہار کو بلایا گیا جونہی اس نے تالے کو ہتھوڑا مارنا چاہا تو اس کا ہاتھ سوکھ کر لکڑی ہو گیا۔ یہ دیکھ کر سید بہت حیران و پریشان ہوئے اور چابی شیخ خاندان کو لوٹا دی کچھ عرصہ بعد یہ خاندان ختم ہو گیا اور چابی ان سادات کی تحویل میں آئی اور وہی قلندر شہباز کی ظاہری خدمات انجام دیتے رہے۔ ان میں سے پہلا خدمت گار سید حاجی محمد صادق شاہ تھا ان کے بعد ان کا بھائی سید اللہ بخش شاہ اور پھر ان کے بھائی سید مراد شاہ کے فرزند ارجمند سید پیر ولی محمد شاہ نے حضرت قلندر شہباز کی ظاہری خدمات بجا لائیں۔

شہباز قلندر کے ہم صحبت

برصغیر میں آنے کے بعد حضرت قلندر شہباز حضرت غوث بہاؤالحق ملتانی ان کے فرزند حضرت شیخ صدرالدین، شیخ فریدالدین گنج شکر اور حضرت جلال سرخ بخاری سے ملے اور ان کی صحبت میں رہے۔ صاحب تحفۃ الکرام نے حضرت قلندر شہباز، حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر، حضرت جلال سرخ بخاری اور حضرت غوث بہاؤالدین زکریا کو "چار یار" کہا ہے اور دکھایا ہے کہ یہ ایک ساتھ سیر و سفر کرتے رہتے تھے۔

حضرت شہباز قلندر اور شیخ صدرالدین عارف کی صحبت کا ذکر تاریخ معصومی تاریخ فیروز شاہی وغیرہ میں بھی ملتا ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت قلندر شہباز نے حضرت غوث بہاؤالدین سے فیض حاصل کیا بلکہ خزینۃ الاصفیاء نے دعویٰ کیا ہے کہ:

"حضرت قلندر شہباز، حضرت شیخ بہاؤالحق کے خلیفہ تھے۔"

تذکرہ الفقراء میں درج ہے کہ "سہروردیہ طریقت کی مختلف شاخوں میں "لعل شہبازیہ گروہ بھی شامل ہے اور اس شاخ کا آغاز حضرت لعل شہباز سے ہوتا ہے۔"

حقیقت میں اس ضمن میں مؤرخین کوئی بھی علمی اور تحقیقی سند نہ دے سکے اور معاصرانہ صحبت کو پیری مریدی سمجھ بیٹھے۔ حضرت شہباز حضرت غوث العالم کے گہرے دوست تھے لیکن مرید نہ تھے۔ حضرت قلندر شہباز کی طریقت، طریقت سہروردیہ سے بالکل مختلف ہے مثلاً قلندری طریقت میں مجردانہ زندگی کا تصور ہے جبکہ سہروردیہ میں

شادی روا ہے' سہروردیہ طریقت کے بزرگ پوری پوری دنیوی زندگی گزارتے ہیں جبکہ قلندریہ میں ایسا نہیں ہے۔ خود حضرت العالم انتہائی دولت مند تھے' حضرت رکن الدین ملتانی محمد تغلق سے وابستہ تھے مخدوم جہاں گشت کا تعلق فیروز تغلق سے تھا اور اس طرح دیگر سہروردیہ سلسلے کے بزرگوں کا حال تھا برخلاف اس کے حضرت شہباز دنیاوی تعلق سے بے نیاز و بے تعلق زندگی بسر کی۔

ان باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قلندر شہباز حضرت غوث العالم کے مرید نہیں تھے بلکہ دوستی' احترام اور عقیدت کی وجہ سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے۔

سید جلال الدین سرخ بخاری

جب حضرت غوث بہاؤ الحق ملتان میں رہتے تھے تو ان کی ملاقات نجیب الطرفین سید علی سے ہوئی۔ حضرت غوث کے بغداد چھوڑنے کے بعد سید مذکور ان کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے۔ ان کے صاحبزادے حضرت جلال الدین اس تعریف سے کافی متاثر ہوئے اور حضرت غوث سے ملنے ملتان آگئے اور واپسی پر سندھ کے شہر بکھر (جو روہڑی اور سکھر کے درمیان ہے) میں سکونت اختیار کر لی۔

ان کا پورا نام جلال الدین لقب جلال سرخ تھا اور ان کے نسب کا سلسلہ امام علی نقی سے جا ملتا ہے۔ "سید جلال الدین جلال سرخ بخاری بن ابی المویدعلی بن جعفر بن محمود بن احمد بن عبداللہ بن علی اصغر بن عبداللہ جعفر بن امام علی نقی۔"

یہ حضرت غوث کے نہ صرف دوست تھے اور ان کے ساتھ سیر وسفر کیا بلکہ ان کی خلافت کا خرقہ بھی حاصل کیا۔

یہ بڑی معرفت کے بزرگ گزرے ہیں۔ سفینۃ الاولیاء کے مصنف لکھتے ہیں کہ:

از بزرگان صحیح است جلیل القدر اور جامع علوم ظاہر و باطن بودند

بکھر کے سید بدرالدین کی چھوٹی بیٹی کے ساتھ ان کا نکاح ہوا۔ تحفۃ الکرام اور اخبار الاخیار میں ہے کہ سید بدرالدین کو بشارت ہوئی کہ وہ اپنی بیٹی سید جلال الدین

کے نکاح میں دے دیں۔

تحفۃ الکرام میں سید بدرالدین کا ذکر اس طرح ہے۔

"سید بدرالدین عرف سید بدر بن سید صدرالدین خطیب کا سلسلہ مصدقہ روایتوں کے مطابق امام علی نقی سے جا ملتا ہے۔ ان کی ذاتی صفات معرفت و دینی حقیقت ہے۔ اولاد و خاندان کی سرداری' نسب کی بزرگی سارے روہڑی میں مشہور ہے۔"

عزیزوں اور دوست احباب کی خواہش پر سید جلال ۱۲۴۴ء میں بکھر آ بسے اور ان کے طفیل یہ جگہ اسلام کی غیر معمولی تبلیغ کا مرکز بن گئی۔ اس کے بعد پنجاب میں سیالوں کے شہر جھنگ کی بنیاد ڈالی اور ساری عمر پنجاب اور سندھ میں اسلام کی تبلیغ کرتے رہے اور بہت سی قوموں نے آپ کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔ ۹۵ سال کی عمر میں ۱۲۹۱ء میں اوچ میں انتقال ہوا اور وہیں مدفن بنا۔

آپ کے بیٹوں میں حضرت سید احمد کبیر سید بہاؤ الدین اور سید محمد تھے۔ سید محمد کے حضرت جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشت فرزند تھے جو ایک بڑے پائے کے بزرگ گزرے ہیں۔ حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی کے پوتے حضرت رکن الدین کے بڑے خلیفہ ہوئے۔ دہلی کے بادشاہ فیروز تغلق ان کے بڑے معتقد تھے اور انہوں نے شیخ الاسلام کا عہدہ سونپا تھا۔

حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ

حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ چشتی طریقت سے تعلق رکھتے تھے اور معرفت کی اعلیٰ منزلوں پر فائز ہوئے۔ آپ کا نام فریدالدین اور لقب گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ تھا۔ آپ کی تاریخ ولادت پر اختلاف ہے۔ صاحب بزم صوفیہ نے ۵۸۲ھ دی ہے جبکہ سیر اولیاء و دیگر تواریخ میں ۵۶۹ھ ہے اور آپ کے روضہ اقدس پر بھی یہی تاریخ رقم ہے۔

تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ بیعت کے وقت آپ کی عمر ۱۸ سال تھی اور بیعت

کے بعد ۸۰ سال تک آپ زندہ رہے۔ اس لحاظ سے آپ کا سن ولادت ۵۶۹ھ ہی بنتا ہے کیونکہ آپ کا انتقال ۶۶۴ھ میں ہوا۔

آپ کے والد بزرگوار کا نام مولانا جمال الدین سلیمان تھا اور دیوان چاولی مشائخ ضلع ملتان کے رہنے والے تھے۔ بچپن میں ہی ان کے والد بزرگوار کی وفات ہوئی۔ ان کی والدہ نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے عالم سے ہی دلائی اور اس کے بعد ملتان بھیج دیا جہاں آپ نے قرآن حفظ کیا اور مولانا منہاج الدین کی مسجد میں فقہ کی مشہور کتاب ''نافع'' شروع کی۔ ایک روز آپ ''نافع'' پڑھ رہے تھے کہ خواجہ قطب الدین بختیار کا کی مسجد میں نماز پڑھنے آئے خواجہ صاحب کی تیز نگاہیں حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ پر پڑ گئیں۔ چند لمحوں کی گفتگو کے بعد خواجہ صاحب کے دست حق پرست پر بیعت کر لی۔ بزم صوفیہ میں تحریر ہے کہ خواجہ نے بیعت کے وقت حضرت بابا سے مخاطب ہو کر یہ رباعی پڑھی۔

مقبول ترجز مقبل جاوید نشد زلطف تو ہیچ بندہ نومید نشد
لطفت بکدام بندہ پیوست دمے کان ذرہ بہ از ہزار خورشید نشد

کئی تواریخ میں تحریر ہے کہ بیعت ملتان میں نہیں ہوئی تھی بلکہ بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ جب دہلی گئے تو ہوئی۔ حضرت خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے کہ مولانا جمال ملتانی نے ملتان میں بیعت کی تصدیق اس طرح کی ہے۔

''در ملتان حضرت شیخ فریدالدین مسعود بہ شرف ارادت مشرف شد۔''

آگے تحریر ہے کہ:

''بتحقیق پیوستہ است کہ حضرت فریدالدین مسعود در ملتان بیعت حضرت زبدۃ الاسرار شیخ الاسلام قطب الدین کا کی روشی مشرف شد۔''

جب حضرت خواجہ صاحب دہلی روانہ ہوئے تو حضرت بابا فرید بھی آپ کے ہمسفر ہوئے ابھی تین منزلیں ہی طے کی تھیں کہ حضرت خواجہ صاحب نے بلا کر فرمایا

"ابھی آپ وہاں جا کر علم کی تحصیل کریں کیونکہ بے علم زاہد مسخرہ یا شیطان ہوتا ہے۔" پھر مرشد کے حکم کے مطابق ملتان آ گئے۔ کچھ عرصہ یہاں رہے اور پھر تعلیم حاصل کرنے قندھار چلے گئے۔ اس کے بعد شہاب الدین سہروردی' سیف الدین باخرزی بہاؤ الدین حموی' سعید الدین حمیدی' شیخ اوحد الدین کرمانی' شیخ فرید الدین نیشاپوری جیسے صوفیوں اور بزرگوں کی صحبت سے فیضیاب ہوئے۔

پانچ سال کی سیاحت کے بعد اپنے مرشد کی خدمت میں دہلی واپس ہوئے اور انہوں نے غزنی دروازے کے برج کے نیچے ایک مقبرہ مرحمت فرمایا اور یہاں ریاضت وعبادت میں مشغول ہو گئے پھر مرشد کی اجازت سے "ہانسی" چلے گئے لیکن معتقدین کے ہجوم سے تنگ آ کر "اجودھن" چلے گئے اور یہاں کچھ عرصہ سکون وتنہائی سے رہے۔

حضرت بابا فرید یہاں تمام دن ریاضتوں میں مشغول رہتے۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ مسلسل ۲۰ سال کٹھن تر ریاضتیں کیں' بغیر کھائے پئے روزے پر روزہ رکھا اور جس روز زیادہ تکلیف وضعف آ تا تو کچھ کھا پی لیتے۔ رمضان کی ہر رات تراویح اور قرآن حکیم کا دور مکمل کرتے۔ کبھی کبھی دس پارے پڑھ ڈالتے۔ کہتے ہیں کہ جب ایک محفل میں یہ شعر پڑھا گیا تو بے ہوش ہو گئے۔

درکوئے عاشقان چناں جاں بدہند — کانجا ملک الموت نگنجد ہرگز

سنہ ۶۶۴ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ کے مریدوں میں حضرت نظام الدین اولیاء دہلوی جیسے عارف گزرے ہیں۔

شاہ صدر الدین لکی والے

سیہون کے قریب "لکی" نامی ایک گاؤں ہے۔ شاہ صدر الدین وہاں کے رہنے والے تھے اور طویل عمر پا کر وفات پائی۔ لکی میں آپ کا مقبرہ مرجع خلائق ہے۔ آپ سید علی مکی کی اولاد میں سے تھے جن کو سندھ کے راجا دلورائے کے بھائی چھٹہ امرانی (جو مسلمان ہو چکے تھے) جا کر سامرہ سے سندھ میں لائے۔ اس لئے کہ راجہ دلورائے کو

زیر کرے اور اس کو بدکاریوں کی سزا دے۔ سید علی کی آمد کے بعد راجہ دلورائے تائب ہوئے اور اسلام قبول کیا۔ اپنی بیٹی سید علی مکی کے نکاح میں دی جس سے سندھ میں سید علی مکی کی اولاد پھلی پھولی۔ شاہ صدر ان کے ایک بیٹے کی اولاد میں سے تھے۔

شاہ صدر، لکی میں گوشہ نشین رہتے تھے اور ہمیشہ عبادت الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ سندھ کے سیر و سفر کے دوران کئی بزرگوں نے آپ سے ملاقاتیں کیں۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری بھی سیر و سفر کے دوران آپ سے ملے۔ آپ کے ملفوظات ''دلیل العارفین'' میں اس ملاقات کا ذکر اس طرح آیا ہے۔

''ایک مرتبہ سیوستان میں خواجہ عثمان ہارونی کے ہمراہ سفر کر رہا تھا۔ ایک جھونپڑی میں ایک درویش شیخ صدرالدین محمد احمد کو دیکھا جو از حد یاد الٰہی میں مشغول تھا اور بزرگ تھا۔ میں چند روز ان کی صحبت میں رہا۔ جو شخص جھونپڑی میں آتا محروم نہ جاتا۔ عالم غیب سے کچھ نہ کچھ اسے دیتا اور کہتا کہ اس درویش کو دعائے ایمان سے یاد کرو۔ اگر میں اپنا ایمان گور میں سلامت لے جاؤں گا تو گویا بڑا کام کروں گا۔ الغرض جب وہ بزرگ موت اور قبر کی ہیبت سنتا تو بید کی طرح کانپتا اور اس کی آنکھوں سے خون جاری ہو جاتا گویا پانی کا چشمہ ہے۔ اس کے بعد سات رات دن تک روتا رہتا لیکن کھڑے ہو کر اور آنکھیں آسمان کی طرف کیے ہوئے ان کا رونا دیکھ کر ہمیں بھی رونا آتا۔ جب رونے سے فارغ ہوتا تو بیٹھ کر ہماری طرف مخاطب ہو کر کہتا: اے عزیزو! جسے موت آتی ہے اور ملک الموت کا سایہ اس کا پیچھا کیے ہوئے ہو اور تیز رفتار قیامت کا ساون اس کے پیچھے آنا ہے اسے خواب و قرار اور خندہ و خوش دلی سے کیا واسطہ اور دوسرے کام میں مشغول ہونا اسے کس طرح بھلا معلوم ہوتا ہے۔''

حضرت بابا فریدالدین گنج شکر بھی سفر کے دوران سندھ کے اس بزرگ سے ملے۔ آپ کی ملفوظات ''راحت القلوب'' میں اس ملاقات کا ذکر اس طرح آیا ہے۔

''فرمایا کہ ایک مرتبہ سیوستان کی طرف مسافر تھا۔ وہاں کے اولیاؤں اور بزرگوں

نے ملاقات کی۔ ایک روز شیخ محمد سیوستانی کی خدمت میں حاضر تھا جو صاحب ولایت بزرگ تھے۔ سلوک کے بارے میں گفتگو ہوئی۔"

یہاں شیخ محمد سے مراد بھی شیخ صدرالدین محمد احمد ہیں۔ شاہ صدرالدین کی اولاد میں بھی بہت سے اولیاء اللہ پیدا ہوئے ہیں جن کی درگاہیں آج بھی سندھ میں مختلف جگہ پر ہیں۔ آپ سندھ کے لکیاری اور راشدی خانوادوں کے مورث اعلیٰ ہیں۔ پیر صاحب پگاڑا اور پیر آف جھنڈو ان کی اولاد میں سے ہی ہیں اور راشدی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔

شہباز قلندر کی سندھ میں سیر و ملاقاتیں

حضرت شہباز قلندر کے سندھ میں گھومنے اور تبلیغ کرنے کے سلسلہ میں تحفۃ الکرام میں لکھا ہے کہ:

"رکن پور" شیخ رکن الدین ملتانی کے نام پر ایک گاؤں ہے۔ یہاں سومرو ذات کے ایک شیخ ریحان رہتے تھے۔ شیخ رکن الدین ان کی زیارت کیلئے یہاں تشریف لائے تھے اور اسی نسبت سے اسے رکن پور کہا جانے لگا۔ شیخ ریحان کا اصلی نام چنیسر تھا۔ کہا جاتا ہے اتفاق سے کسی وقت شیخ رکن الدین اور حضرت قلندر شہباز وہاں آ نکلے۔ آپ سے ملاقات کی اور آپ کو شہد روٹی اور دودھ کی فرمائش کی جو آپ نے پوری کی۔"

تحفۃ الکرام کی دوسری روایت کے مطابق حضرت قلندر شہباز رحمۃ اللہ علیہ شیخ ریحان جھنگلی کے فرزند شیخ دودو کی شہادت کے بعد فاتح خوانی کیلئے بھی گئے تھے۔ وہ جس درخت کے نیچے بیٹھتے تھے۔ وہ صاحب 'تحفۃ الکرام' کے زمانہ میں بھی موجود تھا۔

اگر یہ دونوں روایتیں صحیح ہیں کہ حضرت قلندر شہباز رحمۃ اللہ علیہ شیخ ریحان سے بھی ملے تھے اور وہاں بعد میں بھی گئے تھے۔ تو یہ روایت صحیح نہیں ہے کہ شیخ رکن الدین ملتانی کی بھی شیخ ریحان سے ملاقات ہوئی تھی کیونکہ شیخ رکن الدین حضرت غوث بہاؤ

الدین زکریا ملتانی کے پوتے تھے اور حضرت قلندر شہباز رحمۃ اللہ علیہ کے بہت بعد میں پیدا ہوئے تھے۔ حضرت غوث بہاؤالدین اور آپ کی اولاد کا سندھ میں آنا جانا ثابت ہے کیونکہ سندھ میں آپ کے بہت سے مرید تھے۔ ہوسکتا ہے کہ حضرت شیخ رکن الدین ملتانی شیخ ریحان کے بہت بعد میں آئے ہوں اور آپ کے آنے کی وجہ سے آپ کے مریدوں نے اس گاؤں کا نام ہی رکن پور رکھا ہو۔

صاحب تحفۃ الکرام نے رکن پور کو نیرن کوٹ (موجودہ حیدرآباد) کے نزدیک دکھایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت قلندر شہباز نے سندھ میں دور دور تک سیر و سفر کیا۔ لازمی طور پر سیر و سفر تبلیغی لحاظ سے ہوگا۔ اسی مؤرخ نے دوسری جگہ ''منگھ کے طوق'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

''مشہور پہاڑ ہے۔ حاجی منگو نامی ایک بزرگ وہاں مدفون ہیں جو شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی کے ہمعصر تھے۔ اس کے علاوہ حاجی منگھ پہاڑ میں مخدوم لعل شہباز کی ''کندری'' نامی ایک نہر بھی ہے جس کی دونوں اطراف میں فرحت بخش باغات اور فقیروں کے پرسکون آستانے ہیں۔''

منگھو پیر' کراچی کے قریب ہے اور وہاں کی ایک نہر بقول میر علی شیر قانع حضرت قلندر شہباز کے نام پر تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ وہاں گئے تھے' اس کے بعد ہی اس نہر کا نام آپ کے نام پر پڑا ہوگا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سندھ میں آپ کی سیاحت کا دائرہ کتنا وسیع تھا۔ یہ تو پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ آپ نے سندھ کی سیاحت تبلیغ کیلئے کی ہوگی کیونکہ آپ سندھ کو ایمان کے نور سے منور کرنے کیلئے ہی آئے تھے۔

حیدرآباد کے قریب ''گنجہ ٹکر'' کے نزدیک ٹنڈھ غلام حسین میں آپ کے چلہ کی جگہ مشہور ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے حیدرآباد کی طرف بھی سیر و سفر کیا۔ اس کے علاوہ ایک اور روایت بھی ہے کہ آپ نے حیدرآباد کے اطراف میں ساجن

سوائی اور تاج الدین طریل سے بھی ملاقاتیں کی۔

دوسری روایت ہے کہ آپ نے ٹھٹہ کے پیر پٹہ سے بھی ملاقات کی۔ مولانا عبدالقادر کی تصنیف حدیقتہ الاولیاء میں مذکور ہے۔

شیخ پتہ سرور سلطان دین!	فارس میدان عرفان و یقین
واصل حق صاحب صدق و صفا	مظہر مجموعہ انوار حق!
در کن غار جبل ماوئی گرفت	لعل وش درسنگ خاراجا گرفت
ازخلایق دور باحق در حضور!	مخفی ازچشمہ چوں دردیدہ نور
کس بنودہ مطلع برحال شان!	گوہرے بودہ نہان درجوف کان
اتفاقا شیخ عثمان شاہباز	آں شہ سردار دین و سرفراز
ہمرہ شیخ الشیوخ صدرالدین	شیخ زکریا بہاؤ الدین امیں
ازصفائی باطن و نور ضمیر!	یافتند آں اہل دل راگوشہ گیر
شیخ پتہ از سر صدق و یقین	شد مرید شیخ زکریا امیں

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شہباز قلندر، شیخ بہاؤ الدین اور صدرالدین اس جگہ سے گزرے جہاں شیخ پتہ رہتے تھے۔ جب وہ گزر رہے تھے تو ان کو معلوم ہوا کہ یہاں کوئی اہل دل رہتا ہے۔ اس کے بعد وہ اس سے ملے اور شیخ پتہ صدق اور یقین سے شیخ بہاؤالدین زکریا کے مرید ہوئے۔ اس سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ حضرت شہباز قلندر نے حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریا اور ان کے فرزند شیخ صدرالدین عارف کے ساتھ تبلیغی نقطہ نگاہ سے سندھ کی سیاحت کی۔

ایک عام روایت ہے کہ حضرت شہباز سیہون سے لاہوت بھی گئے۔ وہاں سے ہنگلاج گئے اور پھر کراچی آ کر منگھو پیر سے ملے۔

منگھو پیر سے ملاقات کا ذکر تو صاحب تحفتہ الکرام نے بھی کیا ہے۔ جو پہلے آ چکا ہے۔

یہ بھی روایت ہے کہ آپ نے قدیم پاٹ میں حاجی اسماعیل پنوہر سے بھی ملاقات کی۔ قدیم پاٹ کے کھنڈرات کے قریب حاجی اسماعیل پنوہر کا مزار آج بھی موجود ہے۔

صاحب تحفتہ الکرام نے مکلی کے بزرگوں کے ضمن میں میاں لال کا ذکر بھی کیا ہے جن کے متعلق لکھا ہے کہ وہ حضرت قلندر شہباز کے بھائی یا چچازاد بھائی تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میاں لال یا تو حضرت قلندر شہباز کے ساتھ سندھ میں آئے تھے یا حضرت شہباز کے سندھ میں اقامت اختیار کرنے کے بعد سندھ میں آئے تھے اور آپ کے ساتھ سندھ کی سیر و سفر کیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ حضرت قلندر شہباز نے تبلیغ کیلئے آپ کو ٹھٹھہ میں رہنے کا حکم دیا ہو۔

قلندر شہباز سیاحت کے دوران رشد و ہدایت کے ساتھ خالق حقیقی کی عبادت بھی کرتے رہے ہیں کیونکہ تحفتہ الکرام سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کندری نہر پر اور گنجہ ٹکر کے نزدیک چلہ کش ہوئے۔ سیر و سفر کے بعد جب سیہون واپس آئے تو وہاں سے شر، فساد اور برائی کو جڑ سے اکھیڑ دیا۔ اس کے بعد آپ ہمیشہ یادِ حق میں مشغول رہنے لگے۔ صاحب قلندر نامہ نے لکھا ہے ”اس طرح بحکم الٰہی سیوستان (سیہون) میں تشریف فرما ہوئے اور فساد کو بند کر کے یادِ حق ہمیشہ مشغول رہنے لگے۔“

شہباز قلندر سے فیضیاب ہستیاں

حضرت شہباز قلندر کے عقیدت مند پورے برصغیر میں موجود ہیں۔ سندھ کے علاوہ پنجاب، بلوچستان، سرحد اور بلوچستان و کشمیر جیسے علاقے ہی نہیں بلکہ بھارت، بنگلہ دیش، سری لنکا سمیت ساری دنیا میں آپ کے ماننے والے موجود ہیں تاہم جن بڑی شخصیات نے آپ سے فیض پایا ان کا ذکر ڈاکٹر عبدالمجید سندھی نے یوں کیا ہے۔

سید علی سرمست

کئی کتب میں لکھا ہے کہ علی سرمست بغداد سے آپ کے ہمراہ تشریف لائے۔
حاجی موسیٰ خاں رقمطراز ہیں کہ:

یہ بزرگ حضرت قلندر شہباز کے دوست سید جلال الدین سرخ پوش کے فرزند تھے۔ حضرت شہباز ان پر کافی مہربان تھے یہ قلندر کے وزیر مشہور تھے۔ قلندر شہباز کے پردہ کر جانے کے بعد آپ کے مریدوں نے ان کے ہی ہاتھوں پر بیعت کی اور آپ کی درگاہ کے پہلے خدمت گار بھی یہی بزرگ بنے۔ آپ کا مرقد درگاہ قلندر کے اندر روضہ کے باہر چھوٹے گنبد کے نیچے ہے۔

سید عبدالوہاب

انہوں نے لعل شہباز کے انتقال کے بعد اپنا جداگانہ تکیہ (کافی) بنا لیا اس ''کافی'' کو کچہری والی ''کافی'' کہا جاتا ہے۔

سید عبداللہ شاہ علوی

یہ بزرگ بھی قلندر شہباز سے مستفیض ہوئے اور ''ابدالن والی کافی'' انہیں کے نام سے مشہور ہے۔ انہوں نے بھی اپنی جداگانہ گدی بنائی اور یہ درگاہ ''سید عدل دریا شاہ'' کہلاتی ہے۔

سکندر بودلو

سکندر بودلو کا ذکر اس سے پہلے بھی آ چکا ہے۔ ان کا روضہ قلعہ کے قریب ہے۔ آپ کے روضہ پر روزانہ حضرت شہباز قلندر سے جداگانہ دھمال منعقد ہوتی ہے۔

ہر جمعہ کی رات' رات گزرے بودلو بادشاہ کے فقیر رنگین پوشاک پہنے اور پیروں میں گھنگھرو' لعل شہباز قلندر کے مزار کی جانب ان کی دھمال میں شرکت کرنے رواں دواں ہوتے ہیں۔

سید میر کلاں

اس سے پیشتر بتایا جا چکا ہے کہ ان کی ملاقات شہباز قلندر سے کربلا معلیٰ میں ہوئی تھی اور ان کے کہنے پر سیہون آئے۔ صاحب ''الشہباز'' نے تحریر کیا ہے کہ:

''حضرت قلندر شہباز کے مرشد بابا ابراہیم کے فرزند تھے جن کا شجرہ امام موسیٰ کاظم تک پہنچتا ہے۔''

تحفتہ الکرام میں ہے کہ:

''یہ کربلا معلیٰ کے عظیم القدر سادات میں سے تھے۔ اس مبارک سرزمین پر نکلنے کے بعد پہلے قندھار پھر سندھ پھر سیوستان میں آ گئے اور بڑا وقت شیخ عثمان مروندی کے مزار انور پر گزارا۔ یہ تقویٰ و زہد میں بینظیر تھے۔ ان کی اولاد کافی تعداد میں تھی میر معصوم (تاریخ معصومی کے مصنف) ان کی اولاد میں سے تھے۔''

ڈاکٹر عبدالمجید سندھی کے خیال میں یہاں صاحب تحفتہ الکرام میر علی شیر قانع کو

مغالطہ ہوا ہے۔ حقیقت اس طرح ہے کہ میر معصوم کے والد سید صفائی' سلطان محمود خاں بکھر کی حکومت کے زمانہ میں (۶۹۸-۶۸۲ء) قندھار سے بکھر آئے اور تھوڑے عرصے کے بعد سیہون کے مضافات کے ایک گاؤں "کھابڑوٹ" کے سادات گھرانے میں شادی کر لی جس سے میر معصوم کی ولادت ہوئی۔"

میر کلاں پہلے "کھابڑوٹ" گاؤں میں رہے اور پھر سیہون آ گئے۔ لعل شہباز کی گدی میں ان کی اولاد حصہ دار ہوئی جس میں سید میر خسر' سید میر انور علی' سید گہن شاہ مشہور بزرگ ہیں۔ آج کل اس خاندان کے سربراہ سید صادق علی ہیں۔

سید بھورا بادل شیر

میر کلاں کے فرزند سید محمد کے خاندان میں کامل فقیر بھی گزرے ہیں۔ یہ شہباز قلندر کے مزار کے سامنے ایک اینٹ پر بیٹھ کر عبادت کرتے تھے۔ ایک دفعہ "اولادی کے خاندان کے ایک شخص نے ٹھوکر لگا کر وہ اینٹ نکال دی۔ اس پر شاہ اولادی کے خاندان کو قلندر شہباز کی جانب سے حکم ملا کہ "اس گستاخی کی سزا کے طور پر بادل شیر کو چارپائی دی جائے۔ اب دستور یہ ہے کہ دھمال کے وقت علم کے نیچے بادل شیر کافی (تکیہ) کا فقیر چارپائی رکھ کر ہاتھ باندھے کھڑا رہتا ہے اور دھمال کے خاتمہ تک اسی حالت میں موجود رہتا ہے۔

درگاہ کے دروازے کے ساتھ جنوب کی طرف بادل شیر کی کافی ہے جہاں ان کا مزار ہے اور ان کی گدی پر سید غلام نبی شاہ ولد سید مہدن ور یا ہیں۔

سید نہال شاہ نوری اور بگن شاہ بھی میر کلاں کے خاندان میں گزرے ہیں لیکن نہال شاہ نوری کا روضہ جداگانہ ہے۔ صاحب تحفۃ الکرام نے ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"یہ کھابڑوٹی" سادات سے ہیں جو سیہون کا ایک گاؤں ہے۔ اصلی متولی شیوخ سے زبردستی مخدوم علیہ کی درگاہ کے سجادہ نشین ہو گئے۔ پیر کے فیض کی بدولت ان کا اثر و

رسوخ سجادہ نشین سادات سے بڑھ گیا اور درگاہ کے دروازے کے باہر تخت پر بیٹھنے کی خصوصیات عطا ہوئیں۔ یہی رسم ان کے جانشینوں میں چلی آتی ہے۔''

ان کے بعد خضر شاہ' اس کے بعد موج دریا سجادہ نشین ہوئے۔ اس خاندان میں ''سید انور علی شاہ'' بھی ایک کامل فقیر ہو گزرے ہیں جو بادل شیر کے طالب ''گل شاہ'' کے طالب تھے اور بہت عابد و زاہد تھے۔ اس طرح اس خاندان سے بہت فقراء ہوئے اور ان کے ذمہ درگاہ میں جھاڑو دینے کا بندوبست دیا گیا۔

سید انور علی شاہ کی وفات کے بعد جھاڑو دینے کی ذمہ داری پر نظر شاہ نامی فقیر مقرر ہوئے۔ ان کے بعد ان کے گروہ کے فقراء وقتاً فوقتاً مقرر ہوتے رہے جن میں یقین شاہ' روشن علی شاہ' درباری شاہ' امان علی شاہ' خاکی شاہ' محبوب شاہ' قطب شاہ' شمشیر علی' دیدار علی اور نادر علی شاہ جیسے بزرگ شامل تھے۔ یہ تکیہ اوائل میں ''سخی سرور کا مکان'' کہلاتا تھا۔ اب ''پٹھانوں والی کافی'' کے نام سے مشہور ہے۔

سید صلاح الدین

یہ بزرگ شاہ صدرالدین کی اولاد میں سے تھے اور قلندر شہباز کے ہمراہ سیہون میں تشریف لائے تھے۔

تحفۃ الکرام میں رقم ہے:

''یہ بزرگ لکیاری کے سادات میں سے تھے اور انہیں سجادہ نشینی کا شرف حاصل تھا۔'' صاحب الشہباز نے لکھا ہے کہ:

''لعل شہباز کے وصال کے بعد سیہون میں آئے۔ خدا نے انہیں اولاد کی کثرت سے نوازا تھا جو سب کے سب درویش اور اہل علم ثابت ہوئے۔ بعض لوگوں نے انہیں لعل سائیں کا حقیقی سجادہ نشین ثابت کیا ہے تاہم یہ ابراہیم شاہ کے طالب تھے۔ اولاد کی کثرت کی وجہ سے ''اولادی امیر'' کہلائے۔ ''شاہ اولادی'' کی کافی آپ کی یادگار ہے۔ آپ کی اولاد سجادہ نشینی سے سرفراز ہوتی رہی۔ موجودہ سجادہ نشین محرم شاہ ہیں۔

صاحب تحفتہ الکرام نے لکھا ہے کہ:

"یہ سادات خاندان اپنی ذاتی صلاحیتوں کی وجہ سے دین و دنیا میں نامور ہوئے اور درگاہ کی سجادہ نشینی کی دولت ہاتھ آئی۔ اپنے اعمال اور پیر کی نظر کے فیض سے اپنے مریدوں اور متعلقین کی اصلاح کا موجب ہوئے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے سید پیر شاہ گدی نشین ہوئے اور درگاہ کی سجادہ نشینی سے سرفراز ہوئے۔"

تحفتہ الکرام میں ان کی توصیف و تعریف اس طرح کی گئی ہے:

"یہ تہجد گزار تھے، نفلیں پڑھتے اور ساری رات عبادت میں گزار دیتے تھے۔"

سندھ کے حاکم میاں نور محمد نے انہیں ایک دفعہ زیارت کرنے کیلئے اپنے پاس بلایا لیکن انہوں نے وہاں جانے سے انکار کر دیا اور آخر وہ خود ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پھر بھی انہوں نے ان کا استقبال نہ کیا بلکہ دیکھتے ہی کہا کہ اب دنیا میں رہنے سے بہتر یہ ہے کہ جلد اجل آ جائے۔

اگر تحفتہ الکرام کی مندرجہ بالا عبارت کو قبول کیا جائے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ سید صلاح الدین، حضرت شہباز قلندر کے وصال کے بعد سیہون شریف آئے یا پھر یہ قیاس کرنا پڑتا ہے کہ سید صلاح الدین نامی اس خاندان میں کوئی اور بھی بزرگ گزرے ہیں جنہوں نے لعل شہباز کی قربت حاصل کی تھی۔

سید پیر شاہ کے بعد ان کے بھائی نور شاہ سجادہ نشین ہوئے اور ان کا ظاہری نمونہ بھی ابدالوں کی طرح جو ابدارانہ اور رندانہ رہا۔ ان کے بعد حیدر شاہ ان کے جانشین ہوئے جنہوں نے اپنی زندگی میں اپنے بیٹے نظر شاہ کو جانشین کر دیا تھا۔ نظر شاہ کے بعد ان کے بڑے بھائی اسد شاہ سجادہ نشین ہوئے اور اس کے بعد سید حیدر شاہ نے وفات پائی۔

کہا جاتا ہے کہ اس خاندان کے بعض افراد نے ضلع داود کے گاؤں "ڈاوچ" کو اپنا وطن بنایا۔

شیخ مکھن

تحفتہ الکرام میں بیان ہے کہ:

''قدیم زمانہ میں درگاہ کے متولی اور کلید بردار شیخ تھے۔ شیخ مکھن ان ہی شیخوں میں سے گزرے ہیں۔ تحفتہ الکرام میں لکھا ہے کہ:

''ایک دفعہ سادات نے شیخوں سے درگاہ کی چابی زبردستی حاصل کی لیکن خدا نے چابی کی اس طرح لاج رکھ لی کہ کوشش کے باوجود دروازہ نہ کھول سکے۔ یہاں تک کہ لوہاروں کو بلا کر بھی دروازہ کھولنے سے قاصر رہے۔ آخر ناکام ہو کر چابی شیخوں کے حوالے کی اور انہوں نے بآسانی دروازہ کھول دیا'' (ص ۱۳۶ ص ۱۳۷)

شیخ مکھن کا نام دراصل ''شیخ منکن'' ہے جن کا مزار درگاہ کے اندر ہے۔

مقامی روایات کے مطابق سید ولی محمد شاہ کو شیخوں نے از خود اپنا مرشد ہونے کی وجہ سے چابی بخشی تھی اور پھر وہ لوگ کلید بردار بن گئے۔

شاہ گودڑیو

تواریخ یا تذکروں میں شاہ گودڑیو کا احوال نہیں ملتا لیکن عوام میں مختلف روایات مشہور ہیں مثلاً ایک روایت ہے کہ:

''شاہ گودڑیو کے والد بلخ بخارا کے بادشاہ تھے اور جب لعل سائیں ان کے شہر میں تشریف فرما ہوئے تو آپ نے عرض کیا کہ ''میرے کوئی اولاد نہیں ہے' اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ میرے فرزند ہو۔'' لعل سائیں نے دعا فرما دی۔

حضرت قلندر شہباز کی دعا کے بعد ان کے دو بیٹے پیدا ہوئے' جن میں سے ایک نام ''ادھم'' رکھا۔

ادھم بڑا ہوا کر سلطان ادھم کے نام سے مشہور ہوا لیکن پھر دنیا ترک کر کے بقیہ آدھی عمر فقیری میں گزار دی۔ ان کا مزار خیر پور میرس سے ۱۰ میل دور ایک پہاڑی پر

ہے۔ دوسرا بچہ حضرت شہباز کے ساتھ رہا اور آپ نے ہی ان کی تربیت کی اور روحانی فیض مستفیض فرمایا۔ آپ جب سیر و سیاحت کو نکلے تو ان کے ہمراہ گودڑیو لے کر چلتے۔ لعل سائیں نے انہیں اس پہاڑی پر قیام کرنے کا حکم دیا۔ جہاں اب ان کا مزار ہے۔

آپ کا مزار ضلع دادو کے پہاڑی علاقہ میں ہے۔ آپ کا اصل نام سید عبداللہ شاہ تھا

پیر پٹھو

ان کا کچھ ذکر اس سے قبل بھی آ چکا ہے۔ ان کا اصلی نام حسین، لقب شاہ عالم اور کنیت ابوالخیر ہے لیکن ''شیخ پٹھا'' کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے والد کا نام راجپار اور والدہ کا نام سلطانی تھا جو مراد بن شرفو کی بیٹی تھی۔ یہ ٹھٹہ سے آگے ''آری'' کے مقام پر رہتے تھے۔ ذات کے ''اپلان'' تھے۔

آپ سندھ کے قدیم بزرگوں میں سے گزرے ہیں۔ تحفتہ الکرام میں درج ہے کہ:

''شاہ جمیل گرناری (سید عبدالہادی بن سید عبدالعطاس) بھی ان کے مرید تھے۔ ان کا مقبرہ شیخ پھٹی کے قریب ہے۔ اب جس جگہ پر پیر پٹھو کا مقبرہ ہے وہاں ان کا تکیہ تھا اور اسی جگہ پر ہمیشہ عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے تھے۔''

قلندر شہباز اور حضرت غوث بہاؤ الحق جب سیر و سفر کرتے ہوئے آئے تو یہ ان سے ملے اور ان بزرگوں کے فیض نظر سے پیر پٹھہ نے کمالات حاصل کیے۔

انہوں نے ۶۴۶ھ میں وفات پائی اور انہیں اسی پہاڑ کے غار میں دفن کیا گیا جہاں عبادت میں مشغول رہتے تھے۔''

۱۲ ربیع الاول کو آپ کے مزار پر سالانہ عرس لگتا ہے۔ ٹھٹہ کے عوام کو آپ سے بڑی عقیدت ہے۔

فیروز شاہ تغلق نے ۷۷۲ھ میں ٹھٹہ پر لشکر کشی کی۔ اس وقت ٹھٹہ کا حکمران جام بابینو تھا۔ اس نے تغلق کا مقابلہ کیا جس کے نتیجہ میں لشکر لے کر فیروز شاہ گجرات چلا

گیا۔ ٹھٹہ کے لوگ اس پر بہت خوش ہوئے اور اسے اپنے پیر کی کرامت تصور کرنے لگے۔ فیروز شاہ کا مورخ شمس الدین سراج تاریخ فیروز شاہی میں لکھتا ہے۔

''وماں کرت کہ سلطان فیروز از ٹھٹہ بے غرض سمت گجرات بازگشت۔ ٹھٹھیان این سخن را در وجہت ساختند ومیگفتند ''برکت'' شیخ پٹھا ک مواا ک نٹھا۔''

''اک موا'' محمد تغلق کی جانب اشارہ ہے جو ٹھٹہ فتح نہ کر سکا اور واپسی میں مر گیا اور ''ایک ٹھا'' فیروز تغلق کے جانب اشارہ ہے جو ٹھٹہ فتح کئے بغیر ہی واپس چلا گیا۔

لعل بکر

پسنی بندرگاہ کے رہنے والے تھے اور قلندر لعل سائیں کی نظر سے ''لعل بکر'' کا لقب ملا۔

لعل موسیٰ

یہ بزرگ ٹھٹہ کے رہنے والے تھے۔ تحفتہ الکرام نے ٹھٹہ کے قرب و جوار کے رہنے والوں میں ان کا ذکر کیا ہے کہ ''مخدوم لعل شہباز سے فیض یاب ہوئے۔ ان کی آمد سمہ حکمرانوں کے ابتدائی زمانہ میں ہوئی۔''

حضرت قلندر شہباز سومرو خاندان کے زمانے میں گزرے ہیں اور سومروں کے بعد سمہ برسر اقتدار آئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت قلندر شہباز سے ان کی وفات کے بعد روحانی طور پر فیض حاصل کیا۔

مخدوم بلاول

آپ کا مرقد باغبان تعلقہ دادو میں ہے جہاں نو چندا جمعہ کو میلا لگتا ہے۔ یہ ایک بڑے عالم اور بزرگ درویش تھے۔ تحفتہ الکرام میں ان کا ذکر اس طرح ملتا ہے۔

''یہ بڑے عارف و واصل باللہ بزرگ گزرے ہیں اور علوم ظاہری میں بھی بہت بڑا رتبہ رکھتے تھے۔''

شاہ عبداللطیف بھٹائی

سندھ کے شہرہ آفاق شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی بھی شہباز قلندر کی درگاہ پر حاضری دیتے رہتے تھے اور انکی درگاہ سے فیض یاب ہوئے۔ فقراء کی روایت ہے کہ:

''شاہ اولادی کی کافی میں آ کر رہتے تھے اور اکثر و بیشتر درگاہ پر حاضری دیتے تھے۔'' شاہ صاحب کے احوال زندگی میں بھی سیہون میں آمد ثابت ہوتی ہے۔'' دین محمد وفائی نے ''لطف اللطیف'' میں تحریر کیا ہے کہ:

''شاہ صاحب کے گہرے دوستوں میں دین محمد سیہوانی (وفات ۱۱۹۲ء) بھی ہیں۔ شاہ صاحب سیہون میں مخدوم دین محمد کے پاس سیہون میں آ کر رہتے تھے۔ مخدوم اوران کی اٹھارہ تصانیف ملتی ہیں۔ انہوں نے اردو' فارسی' سرائیکی اور سندھی میں شہباز قلندر کی شان میں بھی اشعار کہے۔

محترم مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ ماہنامہ ''نئی زندگی'' مارچ ۱۹۶۱ء میں لکھا ہے:

''سندھ کے علماء میں شاہ لطیف کے بہت سے احباب تھے جن میں ٹھٹہ کے مخدوم محمد معین اور سیہون کے قاضی دین محمد قابل ذکر ہیں۔''

اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ لطیف سیہون آتے رہتے تھے اور جب آتے ہوں گے تو یقیناً درگاہ پر بھی حاضری دیتے ہوں گے۔

حضرت قادر بخش بیدل

روہڑی کے زبردست عالم' صوفی اور سندھ کے عظیم شاعر حضرت قادر بخش بیدل (ولادت ۱۲۳۰ھ ۱۸۱۴ء وفات ۱۶ ذیقعد ۱۲۸۹ھ) بھی ان کے فیض سے مستفیض ہوئے۔ ۱۴ سال کی عمر میں تمام ظاہری علوم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد حضرت قلندر شہباز کے مزار پر سیہون گئے اور ان سے روحانی فیض حاصل کیا۔

اس کے بعد آپ کی طبیعت شعر وسخن کی طرف مائل ہوئے تو سندھی میں بلند پایہ شعر کہے اور اس کے علاوہ عربی، فارسی، اردو، ہندی اور سرائیکی میں اعلیٰ درجہ کے شعر کہے۔

بیدل نے شعر و شاعری کے علاوہ کئی عربی، فارسی نثر کی کتب بھی قلمبند کیں۔

بیکس

بیکس قادر بخش بیدل کے فرزند تھے اور انہوں نے بھی قلندر شہباز سے روحانی فیض حاصل کیا تھا۔ ۲۸ جمادی الثانی ۱۲۸۵ھ بمطابق ۲ فروری ۱۸۵۹ء میں روہڑی میں پیدا ہوئے۔ جواں سالی میں ۱۲۹۸ھ بمطابق ۱۸۸۲ء انتقال ہوا۔ انہوں نے بھی شعر و شاعری کو اپنا وسیلہ اظہار بنایا اور شہباز قلندر سے اپنی عقیدت کا اظہار انہوں نے بھی اپنی مختلف مدحوں میں کیا۔

سید ناتھن شاہ

''سید ناتھن شاہ ولد سید محمد معین لکوی، سید گلاب شاہ ولد سید صلاح الدین (جو حضرت قلندر شہباز کے سجادہ نشین تھے) کے مرید تھے۔ حضرت قلندر شہباز کی یاد میں ٹھٹہ میں آستانہ بنایا۔''

نین شاہ: نین فقیر

ماضی قریب کے ایک مشہور اللہ والے بزرگ گزرے ہیں۔ یہ سندھی کے بہترین شاعر تھے۔ گڑھی یاسین تحصیل کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ حضرت شہباز قلندر کے زبردست عقیدت مند تھے اور ان کے فیض سے مستفیض ہوئے۔ اپنی جائیداد وغیرہ چھوڑ کر سیہون آ گئے۔ یہاں وہ ''کافی'' گاتے تھے فقراء کے رہنے کیلئے ایک جگہ تعمیر کروائی جو ان کے نام سے ''نین فقیر جی کافی'' مشہور ہے جو آج تک ان کے نام سے مشہور ہے۔

یادگاریں

مشہور ہے کہ قلندر شہباز نے بہت سے مقامات پر چلے کاٹے۔ ان مقامات میں ایک ستون کی غار بھی ہے۔ جو سیہون شہر کے جنوب میں ریلوے سٹیشن سے تھوڑے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کو چہار ستونی اور قلندر شہباز کا تخت بھی کہا جاتا ہے۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ اس یک ستونی کے آستانے پر سید شیر شاہ جلال اور بابا فریدالدین شکر گنج بھی آپ کے ساتھ رہے اور دوسرے درویش بھی آپ کی محفل میں شریک ہوتے رہے تھے۔

اس غار میں جو ایک ستون وسط میں موجود ہے اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے خالص موصلی کا تھا جو عام لوگوں کی گستاخی کی وجہ سے پتھر کا بن گیا ہے۔ اس کیلئے مشہور ہے کہ وہاں قلندر شہباز عبادت الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔

اسی طرح غار میں دو اور گپھائیں ہیں جن کے متعلق مشہور ہے کہ قلندر شہباز اپنے دوستوں کے ہمراہ ان میں سے مدینہ منورہ اور کربلائے معلّٰی کی زیارت کیلئے آتے جاتے تھے۔ اس پورے غار کے اوپر ایک آٹھ کونے کا چبوترہ ہے۔ اس کے چار کونوں پر چار چھوٹے مینار ہیں جس کی وجہ سے انہیں چارکونی کہا جاتا ہے۔ یہ قلندر شہباز کے تخت کے نام سے بھی مشہور ہے۔ یک ستونی کے شمال میں ایک پہاڑی پر قدموں کے نشانات موجود ہیں۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھوڑے

کے ہیں۔ یک ستونی کے مشرق میں پہاڑی پر ایک گنبد اور مزار جو ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں جو ایک سوداگر کے ہیں جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کے پاس قارون جتنا خزانہ تھا۔ وہ قلندر شہباز کی دید کا مشتاق ہوا اور ساری پونجی اکٹھی کر کے آ گیا۔ قلندر اس وقت چلہ کشی میں مصروف تھے لہٰذا دیدار مشکل تھا لیکن آپ نے اس کی آہ و زاری، منت و سماجت سے متاثر ہو کر اسے اپنے دیدار سے نوازا اور کہا کہ تم نے ہمارے چلے کے دوران دیدار کیا ہے اس لئے تم زندہ نہ رہ سکو گے۔ قارون نے خدا کی نافرمانی کی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بے جا الزام لگایا۔ اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے ہمیشہ کیلئے جہنم رسید کر دیا لیکن تم نے اپنی ساری دولت خدا کی راہ میں خرچ کرنے کیلئے یہاں جمع کی ہے، لہٰذا ہم تمہیں ایک شاندار مقام پر پہنچا دیتے ہیں۔ تم ہمارے قارون اور ہم تمہیں جنت کی بشارت دیتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ وہ دولت ریت اور پتھروں کا ڈھیر بن گئی اور اس کے اوپر اس سوداگر کا مزار بنایا گیا۔

قلندر شہباز کے چلے کے آستانوں میں سے ایک ان کا باغ بھی مشہور و معروف ہے جو سیہون ریلوے سٹیشن سے کوئی ایک میل کے فاصلہ پر جنوب میں یک ستونی کی طرف ہے۔ روایتوں میں آیا ہے کہ قلندر شہباز سے پہلے اس طرف سوائے ریت کے ٹیلوں کے اور کچھ نہیں تھا، پانی کا کہیں نام و نشاں نہ تھا لیکن جب قلندر شہباز وہاں آ کر رہے تو آپ نے وہاں لوئے (ایک قسم کا درخت جو سندھ کے علاقہ میں عموماً نظر آتا ہے) کی قلم زمین میں لگا دی جو سرسبز ہو گیا۔ آپ اس کے سایہ میں بیٹھ کر عبادت الٰہی کرتے تھے۔ وہ درخت آج تک موجود ہے جو ''لعل کے لوئے'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا تنا نہایت کہنہ اور کوئی قدیم یادگار معلوم ہوتا ہے۔ آج بھی بہت سے لوگ اپنی مرادوں کی بر آوری کیلئے اس درخت کے تنے سے گزرتے ہیں اور مرادیں حاصل کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ قلندر شہباز کے اس آستانہ پر بیٹھنے کے بعد آپ کے قدم مبارک کی برکت سے اردگرد کی پہاڑیوں میں سے چھوٹے چھوٹے چشمے ظاہر ہو گئے جن کی وجہ سے پورا علاقہ سرسبز ہو گیا۔ اس وقت بھی ان چشموں سے قدرتی پانی خارج ہو کر ایک نالہ کی صورت میں نمودار ہوا جس کو لعل کا نالہ کہتے ہیں یہ بہہ کر قلندر شہباز کے اس آستانہ میں آتا ہے جہاں بہت سے نیم، کھجور اور بیری کے درخت، ایک باغ کی صورت میں اب بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ پھولدار پودے ہیں جن کے پھولوں سے فقراء ہار بنا کر قلندر شہباز کے مزار مبارک پر چڑھاتے ہیں۔ قلندر شہباز کے باغ کے یہ تمام درخت اور پھولوں کے پودے قدرتی طور پر پیدا ہوئے ہیں۔

تشنگ سے دو دن کی مسافت کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا نالہ ہے جس کے کنارے پر لوئے کا درخت موجود ہے جس کا تنا اس نالے کے اوپر پل کی طرح رکھا ہوا ہے۔ فقراء سے معلوم ہوا کہ یہ لکڑی قلندر شہباز نے اس پر رکھ کر اپنے ساتھیوں کو پار اتارا تھا۔ آپ کے قدم مبارک کی برکت سے اس لکڑی کے ایک طرف جڑیں پھوٹ نکلیں اور یہ درخت پیدا ہو گیا۔ اس کے متعلق مشہور ہے اگر نالہ پر رکھی ہوئی لکڑی پڑے پڑے گل سڑ جاتی ہے تو قدرتاً اس کے ایک طرف سے پھر جڑ پھوٹ نکلتی ہے اور تھوڑے ہی دنوں بعد ایک ہرا بھرا درخت موجود ہوتا ہے۔ قلندر شہباز کے فقراء میں سے جو بھی لاہوت لامکاں جاتا ہے وہ اس لکڑی پر سے ضرور گزرتا ہے۔

لاہوت لامکاں میں قلندر شہباز نے بھی بہت سی کرامتیں دکھائیں۔ ایک روایت ہے کہ حضرت شاہ بلاول نورانی نے قلندر شہباز کی دعوت کرنے کی خاطر اپنی دو انگلیاں پہاڑ پر لگا کر ایک سوراخ سے شہد کا کاسہ اور دوسرے سوراخ سے مکھن کا کاسہ بھر کر نکالا اور دونوں کاسے قلندر شہباز کے آگے رکھ دیئے۔ وہ سوراخ آج بھی موجود ہیں۔ اس کے بعد قلندر شہباز نے اپنا ڈنڈا زمین میں گاڑا جو قدرتاً لمحہ بھر میں ایک سرسبز درخت ہو گیا جس کے سایہ میں بیٹھ کر دونوں بزرگ راز و نیاز میں مصروف ہو گئے۔ قلندر شہباز

کے لاہوت لامکاں جانے والے فقراء وہاں جا کر منزل انداز ہوتے ہیں اور ان کو شاہ بلاول نورانی کی طرف سے کھانا وغیرہ ملتا ہے۔ مشہور ہے کہ قلندر شہباز نے شاہ بلاول نورانی کے لائے ہوئے شہد اور مکھن کو اپنے معجزہ سے پتھر کر دیا تھا۔ یہ پتھر قلندر شہباز کے روضہ کی ایک کھڑکی میں نصب ہیں اور علی الترتیب شہد اور مکھن کے نام سے مشہور ہیں۔

قلندر شہباز نے لاہوت لامکاں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے تنبو میں بھی جو ''مولا کا تنبو'' کے نام سے مشہور ہے کئی چلے اور مکاشفات کیے۔ وہاں ان کی کرامت سے ایک آب شیریں کا چشمہ پیدا ہو گیا جو آج بھی موجود ہے۔ اس کے بعد آپ ہنگلاج وغیرہ سے ہوتے ہوئے کراچی کی طرف آئے۔

روایت ہے کہ کراچی سے کچھ فاصلے پر ایک پہاڑی دامن میں منگھو نام کا ایک عامل مقیم تھا جس کا لباس وغیرہ تو درویشانہ تھا لیکن اس کی طریقت کا کسی کو بھی علم نہیں تھا۔ وہ لوگوں کو صرف اپنے علم کے زور پر اپنا معتقد بناتا تھا۔ اس کے پاس ایک مگرمچھ بھی تھا۔ بہرحال وہ ایک طلسمی کارخانہ قائم کیے ہوئے تھا۔ کچھ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ وہاں سے گزرنے والوں کو تنگ بھی کرتا تھا۔ قلندر شہباز اس کے سامنے ایک میدان میں آ کر منزل انداز ہوئے۔ وہاں آپ نے ایک ڈنڈا نصب کیا تو وہاں قدرتاً ایک چشمہ پیدا ہو گیا جو آج بھی موجود ہے اور قلندر کی کشتی کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ تاریخ تحفۃ الکرام میں اس کی تصدیق کی گئی ہے۔

کہتے ہیں کہ جب قلندر شہباز نے منگھو کے مگرمچھ پر سواری کی تو وہ آپ کا معتقد بن گیا اور آپ سے صحیح تلقین حاصل کی۔

درگاہ مبارک کی تعمیری تاریخ

حضرت قلندر شہباز کی درگاہ شریف ملک اختیار الدین نے بنوائی تھی جو فیروز شاہ کی طرف سے سیوستان کا حکمران تھا۔ اس کی بنیاد ۷ رجب ۷۵۷ ہجری کو رکھی گئی جیسے کہ ان شعروں میں بیان کیا گیا ہے۔

بعہد دولت فیروز سلطان دیں پرور
کہ خاک درگہش سازند شاہان جہاں افسر
ازاں گاہے کہ برتخت شہنشاہی نشست آں شہ
سراسر گشت گیتی از شعاع دولتش انور
عمارت شد مقام شاہ عثمان مروندی
ولی اللہ کہ او باز سفید بحر بود و بر
چہ زیبا بار گاہے شد بہشتی طاق بر گنبد
کہ رنگ تہ فلک گشتہ زرنگ بام او اخضر
اگرچہ اولیا اندر زماں شیخ بس بودند
ولیکن در کرامت بود اواز ہمکنار برتر
بروز ہفتم از ماہ رجب بنی شدایں روضہ
بسال ہفت صد پنجاہ ہفت از ہجرت مہتر

بنائش کرد والی اختیار الدین ملک اوشد
امیر عادل و بازل تہمتیں ثانی سکندر
کہ تابودہ است سیوستان نبودہ این چنی والی
سخی و مشفق مکرم تقی پاک دیں پرور
امید آنست می باید جزائے ایں چنی خیری
ہزاراں فیض در جنت زفضل ایزد اکبر

ترجمہ: فیروز شاہ (جو دین پرور حکمران تھا) کے دور حکومت میں ان کی درگاہ شریف تیار کی گئی جب وہ شاہ تخت شہنشاہی پر بیٹھا تو اس کی حکومت کی کرنیں پوری دنیا میں پھیل گئیں۔ عثمان مروندی کی درگاہ کی عمارت جو کہ ولی اللہ تھے سفید و خوبصورت پتھروں سے تعمیر کی گئی۔ آپ کی بارگاہ کو ریشم سے لپیٹا گیا اور خوبصورت گنبد اور بہشتی دروازے قائم کیے گئے کہ اوپر تک اس کا رنگ سبز تھا اگرچہ ان کے زمانہ میں بہت سے اولیاء تھے لیکن ان کی کرامت سب سے زیادہ تھی۔ ماہ رجب کی ساتویں تاریخ کو یہ روضہ تیار ہوا وہ سال سات سو ستاون ہجری کا تھا۔ اس مقبرے کو حکمران اختیار الدین نے تعمیر کرایا بلاشبہ وہ عادل اور ثانی سکندر حکمران تھا جب تک سیوستان کا حکمران تھا اس کی دین پروری، سخاوت، شفقت، زہد و تقویٰ مشہور تھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کار خیر کی ضرور جزا دے گا۔

جب درگاہ شریف تیار ہو گئی تو اس کے سات مہینوں کے بعد ۲ صفر ۷۵۸ھ میں حضرت قلندر شہباز کے وزیر سید سرمست علی شاہ کے مزار مبارک پر بھی ایک مختصر روضہ بنوایا گیا۔ اس کی تاریخ فارسی میں اس طرح کندہ ہے۔

شد بنائے مرقد عالی بعہد شہر یار
شاہ فیروز آنکہ بگرفتہ است زدگیتی قرار

سی سز و گر بندہ درگاہ آں گیتی پناہ
تا کند در سرفرازی بر سلاطین افتخار
بر سر قبر ولی اللہ علی الحق علی
بود از بغداد اندر صفت پاکان شہسوار
ہفتم از ماہ صفراں شد ایں مرقد بسال
ہفت صد پنجاہ ہفت ز ہجرت احمد شمار
بس بزمک باکہ ہفت او راس مرد عزیز
ہر زماں یار بقیرش ہفت ایزو نثار
کرد بنیادش ملک اوشد کہ دور عہد ہا
ہفت اندر عدل دبذل خان خان نامدار
چونکہ ذات او درایں شہر سیوستان آمدہ
تازہ از سرگشت کلابند بدل تو بہار

ترجمہ: شہریار کے زمانہ حکومت میں مزار مبارک تعمیر کیا گیا یہ سب کچھ شاہ فیروز کے حکم کے تحت ہوا اس نے یہ روضہ تعمیر کرا کر سلاطین میں سربلندی حاصل کی۔ بلاشبہ ولی اللہ کی قبر کی تعمیر بغداد کے صالح حکمران کے ہاتھوں ہوئی۔ یہ قبر مبارک ۷۵۸ھ کو تیار ہوئی۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ اس عظیم شخص کی مبارک قبر کا نگہبان رہے۔ بادشاہ سلامت نے اپنے عہد حکومت میں یہ قبر بنوا کر نہایت عمدہ کام کیا۔

اس کے بعد ترخان خاندان کے حاکم مرزا جانی بیگ نے اپنے دور حکومت میں کمال عقیدت سے روضہ شریف کی عمارت کو از سر نو تعمیر کروانا شروع کیا۔

اس کے بعد اس کے فرزند مرزا غازی بیگ نے اس کام کو ہاتھ میں لیا۔ یہ جہانگیر کا دور حکومت تھا۔ غازی بیگ کی عمر نے وفا نہ کی۔ لہٰذا یہ کام نامکمل رہ گیا۔ اس کے بعد ۱۰۳۹ھ میں غازی شہاب الدین کے دور حکومت میں نواب سید بہول المعروف

دیندار خاں بخاری سیہون پہنچا تو اس نے قلندر شہباز کی خانقاہ کی مرمت کرائی اور اسے کانسی کی رنگین اینٹوں سے آراستہ کیا۔ اس کے علاوہ اس نے خانقاہ کے اندر ایک چھوٹی سی شاندار مسجد بھی تعمیر کرائی۔ اس کی منظوم تاریخ اس طرح ہے:

بدوران شہاب الدین جہاں شاہ
جہان از عدل او خورشید آباد
شدہ تعمیر فرش عرش مسند
حسینی سید شہباز یاد!
قبول آمد بنائے خان دیندار
دراں حضرت بعون طالع شاد
چہ گویم وصف آں صحن مقدس
بجائے خشت انجم چیدہ استاد
گر فرشتہ زیر آمد بنائے ایں کند
برابرایں نہ ساز و اگر ہنر جملہ کند یاد
چوں خواہی سال آں با حشم دانش
بمصطع می کہ آمد سال بنیاد
وگر باشد زجنت مسند شاہ

اس عقیدت مند حکمران نے بڑے دروازے کے باہر ایک عمارت تعمیر کرائی جس کی تاریخ اس طرح ہے۔

بدور شہنشاہ شاہ جہاں
جہاں از نواش چوں باغ بہشت
چوں مسجد بنا کرد دیندار خاں
بدر گاہ شہباز عالی سرشت

خرو گفت سالش چوں بیت العتیق
وگر مسجد از شیخ بہوہ نوشت

ترجمہ: شہنشاہ شاہ جہاں کے دور حکومت میں بہشت کا باغ آباد کیا گیا۔ دیندار خان نے حضرت شہباز قلندر کے مزار میں مسجد تعمیر کی ہے۔ عقل نے کہا کہ یہ سال بیت العتیق سے ملتا جلتا ہے۔

قلندر شہباز کے وزیر سید علی سرمست کے روضہ کے شمال میں درگاہ کے مغربی زینہ کی کھڑکی کے جنوب میں ایک دیوار میں تین پتھر لگے ہوئے ہیں جن میں سے ایک پر درگاہ کی عمارت کی تاریخ جو ملک اختیارالدین کے زمانے کی تحریر ہے۔ دوسرے پر سید علی سرمست کے روضہ کی تاریخ اور تیسرے پر یہ الفاظ کندہ ہیں۔

چوں در عہد سلطان فیروز محروم
روضہ قدیم حضرت مخدوم بنائے شد بودایں
دوسنگ تاریخ نوشتہ دن را نصب کردہ بودند آخر گنبدگان
در عہد مرزا جانی ترخانی بتا یافتہ ایں سنگہار ہم آفت
بودندا محال این فقیر کہ سید بہوہ عرف دیندار خاں باشد
در عہد دولت حضرت قرآن ثانی صحن روضہ ترتیب دادہ
دود مسجد تیار ساخت آں راست ساخت ایں دو سنگ بہم
در دیوار خانقاہ نہاد تا یادگار سلاطین گزشتہ باشد

ترجمہ: سلطان فیروز شاہ کے دور حکومت میں حضرت شہباز قلندر کا روضہ مبارک تعمیر کیا گیا۔ آخر گنبدوں پر دو پتھر نصب کئے گئے یہ دیندار خان کی طرف سے تھے۔ قرآن ثانی کے دور میں مزار کا صحن بنایا گیا۔ مسجد کی دائیں جانب دو پتھر آویزاں کئے گئے تا کہ اس خانقاہ میں حکمرانوں کی نشانیاں قائم رہیں۔

درگاہ کے اندران کتبات کے جنوب میں ایک اور پتھر نصب ہے جس پر مسجد کی

عمارت کی تاریخ کندہ ہے۔درگاہ کے دروازہ کے اوپر قرآنی آیات وغیرہ نقش ہیں۔

اس دور میں شہباز قلندر کے مزار پر شیعہ افراد کا اثر و رسوخ بڑھنے لگا۔ مقامی حکمران اور امراء کی اکثریت شیعہ تھی۔انہوں نے مزار مبارک کی ہیئت ہی اپنے مسلک اور عقیدت کے مطابق ڈھالنا شروع کر دی۔ان امراء اور حکمرانوں میں سے ایک میاں غلام شاہ کلہوڑہ آپ کا بڑا عقیدت مند تھا۔اس نے ۱۷۶۳ء میں درگاہ کا فرش اور روضہ مبارک کے سامنے والا بڑا دروازہ بنوایا۔اس کے دونوں طرف دو پتھروں پر فقیر ماہر کی منظوم کی ہوئی تاریخ بڑی نفاست سے کندہ ہے۔اصل عبارت اور ترجمہ پیش خدمت ہے۔

چہ خوش جناب مبارک کہ نور حقانی

زروضہ است عیاں ظاہری زپنہانی

قلندری سخی کام بخش اہل یقیں

ولی رسید عثمان پیر نورانی!

بہ خاص عام کہ مشہور لعل شہباز است

بہ پادشاہ و گداباز داد سلطانی

بایں جناب ہر آنکس ارادتی دارز

بگام میرسد دولت فراوانی

غلام شاہ میاں صاحب سعادت مند

نشان حضرت عباس کاں احساس

سخی و غازی و فیاض معدن الطاف

چوں سرفراز شد از لطف وجود ربانی

زخاص نیت خود کرو تازہ خوش تعمیر

کہ فرش صحن در روضہ شد گلستانی

قبول حضرت مخدوم شد نشانی او
زرحمت نبوی و علی عمرانی!
ہر آنکس کہ دید شوق نور ظہور
شود و چشم دلش روشن و درخشانی
ہزار و یک صدو ہفتاد و سن ہجری بود
زکار داری باقرشاں شداز رانی
رحمت ایزد بود بر تبصرہ و ربانی او
کہ از خدمت شود بخشش دو جہانی
قبولیت ز تعمیر جستم از ہاتف
ندا بگوش من آمد ز لطف سبحانی
زمین مصرع تاریخ خوش بگو صابر
قبول باد نشاں در جناب شاہانی

ترجمہ: کتنے مبارک ہیں یہ نور برحق کہ جن کا روضہ ظاہر و باطن میں عیاں ہے' وہ قلندر اور سخی اہل یقین کی مرادیں پوری کرتا ہے اس نورانی کا نام عثمان مروندی ہے۔ یہ نامی گرامی شخصیت حضرت لعل شہباز قلندر ہیں۔ یہاں پر شاہ و گدا حاضری دیتے ہیں جو شخص ان سے عقیدت رکھتا ہے وہ دنیا و آخرت میں بے شمار دولت کماتا ہے۔ حضرت عباس کا علم اس بات کی دلیل ہے کہ یہ بزرگوار سخی ہیں' غازی ہیں اور بے پایاں مہربانیوں کے پیکر ہیں جب اللہ نے اس حکمران پر کرم کیا تو اس نے اس بارگاہ کی تعمیر کرنے کا ارادہ کر لیا۔ بارگاہ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم اور بارگاہ علوی میں ان کا یہ کام قبول ہو گیا۔ ان کا دل و آنکھ روشن ہو گیا۔ یہ بات ایک ہزار ایک سو ستر ہجری کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس پر مہربانی تھی اس نے اس خدمت سے دو جہانوں کا ثواب حاصل کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی اس عبادت کو قبول فرمایا۔ آسمان سے ندا آئی کہ تمہاری یہ

کاوش قبول ہوگئی۔

علم کے نیچے اینٹوں کا پکا فرش ہے جو ایک پٹھان ٹھیکیدار، مردوس نے بنوایا تھا۔ قلندر شہباز کے وزیر کے روضہ کے آگے جو مسجد ہے وہ لونگ فقیر نے ۱۳۱۹ء میں تعمیر کروائی تھی۔ اس کی منظوم تاریخ جو فقیر محمد صغیر کی ہے اس طرح ہے:

زہے دردر گھر شہباز عثماں
بنا شد مسجد چوں باغ رضواں
فقیری لونگ نام بود اوستدہ
مرادی باد صد برصد بشارت
خلیفہ او بنا کرد ایں عبارت
گرانمایہ گرامی بود خورسند
نشاں بیک درگاہ بگداز شت
لوائی نیک نامی بر افراشت
زہر زاہد محراب کہ شد
منور آں غیرت خوردم شک شود
بباید ایں چنیں ذی دولتاں را
کہ بگذرد در دنیا نشاں را
اگر خواہی بزیارت خود بیائی
نہ بینی مقبرہ خوش خانقاہی
چوں پرسیدم سن وسال دینایش
بنائے مہر آسا ماہ سایش
ندا خود از قصوریں خوش بداوا
صغیرا گو کہ قصرا فیض باوا

ترجمہ: اچھے نصیب کی بات ہے کہ شہباز قلندر کے گھر باغ رضوان کی مانند مسجد تعمیر کی گئی۔ اسے لونگ فقیر نے بنوایا تھا۔ سینکڑوں بشارتوں کے بعد خلیفہ نے یہ کام کیا۔ اس نے یہ کام کر کے بارگاہ خداوندی سے ثواب کمایا ہے۔ یہ نیک کام وہ حکمران کرتے ہیں جو فکر آخرت رکھتے ہیں تا کہ ان کا یہ کارنامہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے باقی رہے اگر آپ ان کی زیارت کیلئے آنا چاہیں تو اس میں دوسرے مقبروں والی بات نہ پائیں گے۔ یہ ۱۳۱۹ء میں تعمیر ہوئی اس پر شعر فقیر محمد صفیر نے کہے ہیں۔

ہدیات عقیدت

ہم نے درگاہ میں نصب جن کتبات کی تحریریں پیش کیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ ہر حکمران نے اپنی استعداد اور ذوق کے مطابق درگاہ کی تعمیر و آسائش کا سلسلہ جاری رکھا۔ درگاہ کی تعریف کرتے ہوئے شاہ شرف الدین ایک منقبت میں فرماتے ہیں۔

عجیب دیدم بدر گاہ قلندر نجف چو مشہد نور منور
طواف تربت آں شاہ سرور ثواب غازیاں را حج اکبر

ترجمہ: میں نے درگاہ قلندر میں نجف و مشہد کی طرف عجب نور دیکھا ہے۔ اس بزرگوار کی قبر میں اس کا طواف حج اکبر کا ثواب رکھتا ہے۔

قلندر شہباز کے حضور میں آج بھی یہ کرامت دیکھنے میں آتی ہے کہ روضے کے اندر کتنے ہی آدمی کیوں نہ ہوں جگہ کی تنگی ہرگز محسوس نہیں ہوتی۔ روضہ میں قلندر شہباز کا ہی مزار مبارک ہے جس پر منقش نقرئی کٹہرہ ہے جو ایک سنگ مرمر کے تخت پر رکھا ہوا ہے۔ کٹہرے کے اوپر ایک خوبصورت چھتری بنی ہوئی ہے جس میں جھاڑ فانوس اور دوسری نایاب چیزیں لٹکی ہوئی ہیں۔ اس چھتری میں سرہانے کی طرف وہ گلوبند کا پتھر لٹکا ہوا ہے جو انہیں اپنے مرشد جمال شاہ سے عطا ہوا تھا اور وہ آخر دم تک آپ کے سینے سے لگا ہوا تھا۔ اس گلوبند میں بہت سی کرامات بتائی جاتی ہیں۔ بہت سے سائل پانی کا پیالہ اس سے مس کر کے جاتے ہیں۔ اس پانی کے اثر سے ان کی بہت سی

مشکلات آسان ہو جاتی ہیں۔

مشہور ہے کہ ایک مرتبہ پتھر نیچے گر کر دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ ان ٹکڑوں کو سیہون کے ایک کاریگر نور محمد تیموری نے کچھ اس قسم کے مصالحہ جات سے ایک کر دیا ہے کہ نشان تک بھی معلوم نہیں ہوتا۔ مزار کے اوپر چاندی کا کٹہرا لاڑکانہ کے ایک زمیندار محبوب خان وگن نے بنوایا تھا جو اس سے پہلے صندل کی لکڑی کا بنا ہوا تھا۔

مزار مبارک کے سرہانے کی طرف ایک چھوٹا سا چبوترا دو فٹ اونچا اور چار فٹ طویل ہے جس پر چراغ رکھے ہوئے ہیں ان کی جگمگاتی روشنی میں فقراء اور زائرین رات خواہ صبح صادق تک ہر وقت قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہتے ہیں۔ ان چراغوں پر ایک انتہائی خوشنما چراغ ہے جو دو تین حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ اس کے وسطی طبقہ پر مندرجہ ذیل رباعی کندہ ہے۔

اے شمع سوز کہ شب وزار است ہنوز — اے صبح مدام کہ وقت نماز از ہنوز

بزمی تو بر و بجائے خودو شاداں — ایں قصہ عاشقاں دراز است ہنوز

ترجمہ: اے شمع جلتی رہ ابھی رات باقی ہے' اے صبح اب نماز کا وقت ہے' اس بزم سے تو خوش ہو جا کہ عاشقوں کا قصہ بہت طولانی ہے۔

اور نچلے طبقے پر فارسی زبان میں یہ الفاظ نقش ہیں:

پیر میاں حاجی بحرالدین سرہندی — درگاہ مخدوم لعل شہباز بلند پرواز

بطریق نذرانہ دادہ شد فی التاریخ — ۱۱ ماہ ذی القعد سنہ ۸۳۰ ہجری مقدس

ترجمہ: پیر میاں حاجی بحرالدین سرہندی نے مخدوم لعل شہباز قلندر کی بارگاہ میں ۱۱ ذیقعد ۸۳۰ھ کو نذرانہ پیش کیا۔

اس طرف دیوار کے ساتھ ایک گھنٹہ لٹکا ہوا ہے جس کو فقیر کسی خاص مواقع پر بجاتے ہیں۔ اس جگہ وہ عصا بھی رکھا ہوا ہے جس پر غلاف چڑھا ہوا ہے۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ یہ شہباز قلندر کو اپنے مرشد حضرت شاہ جمال نے بطور انعام عطا کیا

تھا اور یہ وہی عصا ہے جس سے آپ نے اس زمیندار کو زخمی کیا تھا جو کتا بن گیا تھا۔

مغربی حصہ میں ایک محراب نما کھڑکی میں دو پتھر لگے ہوئے ہیں جن کو عام طور پر ''شہد اور مکھن'' کے نام سے پکارا جاتا ہے کیونکہ ان کی تصاویر یہی کچھ اس قسم کی ہیں۔ ان کے متعلق بیان پہلے آچکا ہے۔ اس محراب پر سیہون کے ایک عقیدت مند سنار محمد عرس نے شیشہ کا عجیب و غریب جڑاؤ دار کام کروایا ہے جس کی وجہ سے آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں۔

سرہانے کی طرح بائیں حصہ میں بھی ایک چبوترا بنا ہوا ہے جس پر بیش قیمت چراغ رکھے ہوئے ہیں۔ روضہ کے مشرقی حصہ میں ایک نقرئی دروازہ ہے۔ روضہ کے اندر جانے کیلئے یہ واحد دروازہ تھا۔ اب تین دروازے ہیں۔

باہر اس دروازے کے اوپر ایک ہردات کا پنجرہ بنا ہوا ہے جسے استاد نور محمد سیوہانی نے ۱۳۱۲ء میں تیار کیا تھا۔ یہ انتہائی خوشنما بنا ہوا ہے۔ اس پر عربی رسم الخط میں ایک شعر مرقوم ہے جو اس طرح ہے:

زہے زپنجتن وظیفہ احسن
محمد است علی فاطمہ حسن حسین

علاوہ ازیں اس پنجرہ پر بہت سی قرآنی آیات اور نادعلی منقوش ہیں۔ یہ الفاظ طلائی روشنائی سے تحریر کئے ہوئے ہیں۔

اس دروازہ کے دائیں جانب حضرت علی کا اسم مبارک چار مرتبہ تحریر کیا ہوا ہے اور درمیان میں عجیب طرز پر نقش کیا ہوا اللہ کا اسم مبارک دیکھنے سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

بائیں طرف ایک پتھر پر مندرجہ ذیل الفاظ کندہ ہیں۔

یہ غلام لعل شہباز کا فقیر چھتہ
سنگتراش ہے ۱۲۲۸ھ تاریخ ۸ ماہ

باہر روضہ کے دائیں جانب حضرت قلندر شہباز کے وزیر سید علی شاہ سرمست کا

ایک چھوٹا سا گنبد عجیب و غریب طرز پر بنا ہوا ہے۔ اس کے قریب ایک مسجد بنی ہوئی ہے جس کا اس سے پہلے ذکر آ چکا ہے۔ مسجد کے سامنے بائیں جانب پتھر کے ستونوں پر ایک کشتی بنی ہوئی ہے جس سے پورے صحن کی شان دوبالا ہو گئی ہے۔ مروی ہے کہ پہلے یہ کشتی بطور سائبان قلندر شہباز کے مزار پرانوار پر رکھی ہوئی تھی۔ کشتی کے قریب خانچیں کی ایک قطار ہے۔ ایک خانچی میں ایک مزار ہے جس کے متعلق مشہور تو یہ ہے کہ وہ قلندر شہباز کے روضہ کے معمار کی ہے لیکن تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ یہ مزار ایک سید محبّ شاہ بخاری کا ہے جو کہ قلندر شہباز کے طالبوں میں سے تھا۔ اس قطار کی آخری خانچی میں ایک اور مزار ہے جو حضرت میاں مگن جتی کا ہے جو ایک بڑے ولی اللہ ہو گزرے ہیں۔ اس خانچی کا دروازہ ہمیشہ بند رہتا ہے کیونکہ اسے قلندر شہباز کا توشہ خانہ کہا جاتا ہے اور اس میں آپ کے غلاف، دستاریں اور دوسرا سامان رکھا جاتا ہے۔ ان خانچیوں میں سے ایک میں قلندر شہباز کا نقار خانہ رکھا ہوا ہے۔ یہ نقارے بادشاہان وقت کے بطور نذرانہ پیش کیے ہوئے ہیں اور تمام تانبے کے بنے ہوئے ہیں۔ ان پر قلندر شہباز کے فقراء دھمال کرتے تھے۔

مزار مبارک کی رسومات

نوبت و دھمال

ڈاکٹر عبدالمجید سندھی نوبت و دھمال کے بارے کتاب ''قلندر شہباز'' میں لکھتے ہیں کہ حضرت قلندر شہباز کی درگاہ میں تین وقت نوبت لگتی ہے۔ ایک شام کے وقت' دوسری رات کے وقت جبکہ دروازہ بند کیا جاتا ہے اور تیسری تہجد کے وقت جب درگاہ کا دروازہ دوبارہ کھول دیا جاتا ہے۔ اس نوبت کے اوقات کار مقرر کرنے کیلئے قدیم زمانہ کا گھڑیال رکھا ہوا ہے۔ اس کے قریب ایک دیگچہ میں پانی بھرا ہوا ہوتا ہے جس میں ایک سوراخ دار پیالی پڑی ہوتی ہے جس میں باریک سوراخ سے پانی رس رس کر اندر آتا رہتا ہے جب یہ پیالی ڈوب جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک گھڑی گزر گئی۔ اس طرح اوقات معلوم ہوتے رہتے ہیں اور جب ایک گھڑی گزر جاتی ہے تو نوبت پر چوٹ لگائی جاتی ہے جس سے ایک گھڑی گزرنے کا اعلان ہوتا ہے۔ تین وقتی نوبت کو دھمال کہا جاتا ہے۔

دھمال سندھ کے دیگر بزرگوں کی درگاہوں پر بھی لگتی ہے۔ دراصل دھمال ہندی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے لغوی معانی ''شوروغل' تھپ'' اور ''چوٹ'' اور ''دھماچوکڑی'' وغیرہ کے ہیں۔ اصطلاحاً یہ ایک قسم کا راگ ہے جو فقیر عموماً الاپتے ہیں۔ سندھی لغت مطبوعہ ۱۸۷۳ء کے مطابق:

''دھمال ایک سر کا نام ہے جو ہولی کے زمانہ میں الاپا جاتا ہے اور ''دھمار'' ایک تار

کا نام بھی ہے۔"

"راگ ساگر" ص ۲۴۰ میں لکھا ہے کہ:

"دھمال میں ۱۴ ماترائیں ہوتی ہیں۔" دھمال میں نقارہ خاص وجد پیدا کرتا ہے جس کو "بھیر" کہا جاتا ہے۔ جب نقارہ بجانے لگتے ہیں تو فقراء وجد میں آتے ہیں۔

جلیل سیہوانی روایت کرتے ہیں کہ:

ایک مرتبہ علامہ محمد ہاشم ٹھٹھوری محض اس خیال سے سیہون تشریف لائے تھے کہ خلاف شرع جو یہ نوبتیں اور نقارے بجائے جاتے ہیں انہیں بند کرایا جائے لیکن جب آپ عین نوبت بجنے کے وقت پر قلندر شہباز کے صحن اقدس میں پہنچے تو بذات خود بے اختیار ہو کر دھمال کرنے لگے۔ آپ کے رفیق یہ دیکھ کر وفور حیرت سے آپ سے اس کا سبب معلوم کرنے لگے تو آپ نے کہا کہ یہاں آ کر میں نے دیکھا کہ مجھ سے بلند مرتبہ بہت سے اولیاء اللہ قلندر شہباز کی دھمال کھیل رہے ہیں۔ تو میں بھی بے اختیار ہو کر اس میں شامل ہو گیا۔

قلندر شہباز کے روضہ اقدس کے بیرونی صحن میں علم کے نیچے ہر سال میلہ کے دنوں میں ۱۹-۱۹۱۸ اور ۲۰ شعبان کو قلندر شہباز کے فقراء کی دھمال ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اوائل میں قلندر شہباز کے تمام فقراء مل کر نقاروں کی آواز پر قلندری رقص یا دھمال کرتے تھے۔ لیکن بعد میں جب فقراء کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی تو صحن میں اس ہجوم کی دھمال کی گنجائش نہ رہی لہٰذا اس صورت میں ہر کافی کے فقراء کو دھمال کرنے کیلئے الگ الگ وقت دیا جانے لگا۔ یہ طریقہ آج بھی جاری ہے۔

سب سے پہلے "ابدال کی کافی" کے فقراء دھمال کرنے کیلئے آتے ہیں اور مزار کی زیارت کرنے کے بعد پھر دھمال کر کے اپنا وقت ختم ہونے پر اپنی کافی کی طرف واپس چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد محفل خانہ کافی کے فقراء کے ساتھ خود سخی سلطان کے فقراء بھی آتے ہیں اور اسی طرح دھمال اور زیارت کر کے اپنی کافی میں چلے جاتے ہیں۔

اس وقت اس کافی کے سرکردہ سید سابو شاہ ہیں۔ ان کے بعد شاہ صلاح الدین اولا دی کے فقراء کے ساتھ ابراہیم شاہ جتی' بودلہ بہار' جمن جتی' دودو حقانی' حاکم علی شاہ پٹ والا اور مزاری شاہ کے فقراء مل کر دھمال کرنے کیلئے آتے ہیں اور تھوڑی دیر کے بعد جب وہ زیارت کیلئے اندر جاتے ہیں تو بادل شیر کے فقراء آ کر دھمال کرتے ہیں اور خوب رقص کرتے ہیں۔ پھر اولا دی امیر کے فقراء بھی زیارت سے فارغ ہو کر آ کر ان کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ایک حیرت انگیز سماں بند جاتا ہے۔ ایک طرف نقاروں کی گونجدار آواز دوسری طرف فقراء کی ناد اور نفیلوں کی آواز اور تیسری طرف فقراء کے قلندرانہ رقص سے ناظرین پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور چھوٹے بڑے کے منہ سے بے اختیار "مست دم مست قلندر" بلند ہونے لگتا ہے۔ کوئی پندرہ بیس منٹ تک مل کر دھمال کرنے کے بعد بادل شیر کے فقراء روضہ میں زیارت کیلئے جاتے ہیں اور اولا دی امیر کے فقراء دھمال کرنے کے بعد اپنی کافی کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ اسی طرح بادل شیر کے فقراء بھی زیارت کے بعد دھمال کر کے اپنی کافی کو واپس ہوتے ہیں۔

اب جس میدان پر فقیر دھمال کرتے ہیں اس کے چاروں طرف پچیس تیس فٹ پر اونچی کافیاں بنی ہوئی ہیں۔ اس جگہ بہت سے زائرین اور افسران بیٹھ کر دھمال سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ دھمال کا یہ سلسلہ دوپہر تک ختم ہو جاتا ہے۔ دھمال سے لوگوں کی اس حد تک دلبستگی ہوتی ہے کہ بہت سے عقیدت مند دھمال کرتے فقیروں کی ویڈیو ریکارڈ کر لیتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان' پاکستان ٹیلی ویژن اور دیگر قومی اداروں کی طرح غیر ملکی ذرائع ابلاغ کے نمائندے بھی ان مناظر کو ریکارڈ کرتے ہیں اور اپنے اپنے ملکوں میں اسے برصغیر کے صوفیانہ رنگ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

مہندی

قلندر شہباز کے میلے کے ان تین دنوں میں جس طرح صبح کے وقت دھمالیں ہوتی

ہیں۔ اسی طرح شام کے وقت مہندی اٹھائی جاتی ہے۔ پہلی مہندی ۱۸ شعبان کو سید گل محمد شاہ جو لکیاری خاندان کے سجادہ نشینوں کے چشم و چراغ تھے' کی طرف سے اٹھائی جاتی ہے۔ جس کے ساتھ صوفی فقراء کی جماعتیں گاتی بجاتی اور ناچتی چلتی ہیں اور یہ مہندی گشت کی صورت میں مغرب کی نماز سے قبل قلندر شہباز کی درگاہ پر مغرب سے پہلے پہنچتی ہے۔ دوسرے دن ۱۹ شعبان کو اسی وقت محلّہ ٹھٹ میں سے میرانی ہندو دیوان مولچند کی طرف سے مہندی نکالی جاتی ہے جس کے شہر میں گشت کے ساتھ بھی صوفی' فقراء اور گویئے ہوتے ہیں۔

تیسرے دن ۲۰ شعبان کو کھڈ میں سے قانو گو ہندوؤں کی طرف سے مہندی اٹھائی جاتی ہے چونکہ یہ محلّہ زیادہ فاصلے پر ہے۔ اس لئے مہندی کا تماشا زیادہ نمایاں اور لطف انگیز ہوتا ہے اور زائرین اس سے خوب محظوظ ہوتے ہیں۔

جس وقت یہ مہندیاں اٹھائی جاتی ہیں اس وقت قلندر شہباز کے روضہ کے صحن میں خوب آتشبازی ہوتی ہے اور لوگ چمڑے کے لباس پہن کر ٹوٹنے وغیرہ جلاتے ہیں۔ جب صدہا جلتے ہوئے ٹوٹنے میدان میں رقص کرتے ہیں تو اس وقت ایک عجیب وغریب سماں پیدا ہو جاتا ہے۔ بہت سے لوگوں کے کپڑے جل جاتے ہیں لیکن اس لطف کی وجہ سے وہ اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔

دوسری طرف سندھی کشتی (ملاکھڑا) بھی زور وشور سے چالو رہتا ہے جس میں سندھ کے مشہور و معروف پہلوان (ملحہ) حصہ لیتے ہیں اور اپنی پہلوانی کے جوہر دکھاتے ہیں۔ یہ میدان بھی عجیب طریقہ پر بنا ہوا ہے اس کے وسط میں گیلریوں کی طرح مکانات بنے ہوئے ہیں جن پر ہزارہا آدمی بیٹھ کر اس تماشا سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

بہرحال قلندر شہباز کا عجیب وغریب میلہ صرف دیکھنے سے ہی تعلق رکھتا ہے اور جس نے ایک مرتبہ اسے دیکھا وہ باوجود مصروفیت کے دوسرے سال بھی ضرور اس کے

دیدار پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

عرس کے ایام میں جھولے' موت کا کنواں' سرکس' تھیٹر اور عارضی بازاروں کے ساتھ مٹھائی' کھلونوں' چوڑیوں' کڑوں' کتابوں' پھولوں اور عام استعمال کی سینکڑوں اشیاء کی دکانیں لگتی ہیں۔ سرکاری سطح پر حضرت عثمان مروندی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیات اور تعلیمات بارے مذاکرے اور سیمینار ہوتے ہیں۔ محکمہ زراعت سندھ ایک زرعی نمائش کا اہتمام کرتا ہے جبکہ ملک بھر سے آئے مختلف قوال اپنے ساتھیوں کے ساتھ قلندر پاک کی شان میں مختلف شعراء کا کلام اپنی مخصوص لے میں گاتے ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جس طرح درگاہ کی عمارت کے مختلف حصے مختلف ادوار میں تعمیر ہوتے رہے اسی طرح عرس اور عام دنوں میں مزار کی رسومات بھی مختلف ادوار کے رجحانات کے باعث مستحکم ہوتی چلی گئیں۔ آج ہمیں مزار مبارک پر رسومات کا جو ہجوم دکھائی دیتا ہے۔ ان میں سے اکثر صرف دو ڈھائی صدیوں کے دوران کی پیداوار ہیں۔

حضرت شہباز قلندر کی شاعری

حضرت شہباز قلندر کے کلام کا بڑا موضوع عشق کا جذبہ ہے۔ وہ جس بھی موضوع کو لیتے ہیں اس کا لہجہ اسلوب اور فکر قلندری رنگ میں رنگا دکھائی دیتا ہے۔ ایک عجیب طرح کی مستی امنڈتی ہوئی ان کے اشعار سے محسوس ہوتی ہے۔ انہوں نے جوش اور جذبے کا اظہار اس انداز سے کیا ہے کہ ڈاکٹر عبدالمجید سندھی کے بقول ''ان کے خیالات عام صوفیانہ اصطلاحات سے مختلف اور بالکل منفرد ہو جاتے ہیں۔''

حضرت عثمان مروندی نے شعری اظہار کیلئے فارسی زبان کو ذریعہ بنایا جو ان کے زمانے میں برصغیر کے امراء و حکمرانوں کی روزمرہ زبان بن چکی تھی جبکہ آپ کی مادری زبان بھی فارسی تھی۔ سب سے پہلے سید عثمان مروندی المعروف شہباز قلندر کی نعتیہ شاعری سے ایک منتخب نعت کا مطالعہ کرتے ہیں۔

آن شاہ ہر دو عالم عربی محمد است — مقصود بود آدم عربی محمد است

صد شکر آں خدائے کہ پشت و پناہ خلق — شاہنشہے مکرم، عربی محمد است

ماراز جرم حال پریشاں و لے چہ غم — چوں پیشوائے عالم عربی محمد است

ماراچہ غم بود کہ چنیں سایہ سر براست — غم خوار حال زارم، عربی محمد است

بختم مدد نمود کہ ازا منتش شدم — مطلوب و جان جانم، عربی محمد است

ختم رسل، چراغ رہ دین و نور حق! — آن رحمت دو عالم، عربی محمد است

آں سرور خلائق وآں رہنمائے دین | آں صدر و بدر عالم' عربی محمد است

آں کعبہ معارف و آن قبلہ یقین! | آں شاہ دیں پناہم عربی محمد است

کن پیروی راہ دے ار بادیت نجات | شاہنشہے معظم' عربی محمد است

عثمان چوشد غلام نبی وچہار یار | امیدش از مکارم' عربی محمد است

ترجمہ: محمد عربی دونوں جہانوں کے مالک ہیں اور وہی آدم کا مقصود اول ہیں۔

اس خدا کا شکر ہے کہ دنیا کا ملجاو ماوا اور آقا محمد صلی اللہ علیہ وسلم عربی ہیں۔

مجھے اپنے گناہوں سے پریشان ہونے کا کیا غم جبکہ پوری دنیا کے رہنما و سہارا محمد عربی ﷺ ہیں۔

مجھے کیا غم جبکہ میرے سر پر ان کا سایہ ہے اور میرے غمخوار محمد عربی ﷺ ہیں۔

ختم رسل' راہ دین کے چراغ' نور حق' دونوں جہان کیلئے رحمت محمد عربی ﷺ ہیں۔

وہی سرور خلائق ہیں' وہی رہنمائے دین ہیں' وہی پوری دنیا کیلئے روشنی ہیں

وہی تمام علوم کے مرجع اور یقین کے قبلہ ہیں' وہی دیں پناہ ہیں۔

ان کے راستے پر چلنا ہی نجات کا باعث ہوگا

اے عثمان جب تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے چاروں دوستوں کا غلام ہو گیا تو پھر محمد عربی ﷺ کے کرم کی امید پیدا ہو گئی۔

انگریزی کتاب ''پرشین پوئٹس آف سندھ'' میں قلندر لعل شہباز کے علم کی بابت تحریر ہے کہ قلندر لعل شہباز ایک زبردست روحانی شاعر اور عالم تھے۔ کتاب کا مصنف قلندر لعل شہباز کے اشعار سے بے حد متاثر نظر آتا ہے۔ ساتھ میں کئی کتابوں کے حوالے سے تحریر کرتا ہے کہ قلندر لعل شہباز کی فارسی کی کتنی ہی کتابیں ماضی میں درس گاہوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔ ان کتابوں کے نام جو صاحب موصوف نے درج کئے ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) عقد (۲) قسم دوئم (۳) اجناس (۴) میزان صرف وغیرہ۔ صاحب موصوف اپنی کتاب میں مزید تحریر کرتے ہیں کہ قلندر شہباز کا کلام حقانی کلام ہے اور ایسے روحانی رموز جن میں الہامی گفتگو کی بو آ رہی ہے آپ کے کلام میں سے ملائکہ کے درجہ والی حیثیت نظر آتی ہے۔ اس کتاب میں قلندر لعل شہباز کے کچھ اشعار بھی درج ہیں جو قارئین کی دلچسپی کیلئے درج ذیل ہیں۔

غزل

خورشید ہر دو عالم' تاباں شد است مارا
از عرش تا سراپا' غلطاں شد است مارا

''روح الامیں'' بسوز و یک موٗ اگر بجند
ہر صبح و شام زآں جا طیراں شد است مارا

آں راں کہ قدسیاں را دشوار سخت آید
از فضل حق تعالیٰ' آساں شد است مارا

چیزے کہ انبیاء راہ' امکاں زبود گاہر
آں چیز خو با آساں' امکاں شد است مارا

افلاک یا کواکب' مکاں ملاء اعلیٰ
ہر یک زجا کری ماشاداں شد است مارا

احمد بعرش اعلیٰ، موسیٰ بکوہ نالہ
از لطف درکنارش، طیران شد است مارا

امروز شاہ شاہان مہماں شد است مارا
جبرئیل با ملائک دربان شد است مارا

براق لا ویالی، زیر رکاب من است
صحرا لایزالی، میداں شد است مارا

دربار گاہ وحدت، کثرت چہ کار آید
ہژدہ ہزار عالم یکساں شد است مارا

ذات کہ بچگونہ، صورت نہ بود ہرگز
آں ذات خود بصورت، عیاں شد است مارا

خال خجستہ میموں، اختر بلند طالع
بے برگ بے نوائے، آساں شد است مارا

بنید روئے مارا، دوزخ حرام گردد
کان دہن بستہ غنچہ، خنداں شد است مارا

اوصاف ذات خودرا ، ایز دیداد مارا
برکشف ایں عجائب ' پایاں شد است مارا

بت خانہ جہاں را بسیار سیر کر دم
با ذوق ایں معالی ' عرفاں شد است مارا

دریا کے بے نہایت ' پایاں کجا است اورا
بنگر بغیر کشتی پایاں ' شد است مارا

باخلق احتیاجی ' عثمان نہ ماند اینجا
زیراں کہ در اطاعت یزداں شد است مارا

ترجمہ:

دو عالم کے سورج نے ہمیں روشن کر دیا ہے' عرش سے پورے وجود تک ہمیں سرشار کر دیا ہے روح الامین تشریف لاتے ہیں اور صبح وشام ہمیں عبادت الٰہی کا خوگر بنا دیا ہے جو کام قدسیوں (فرشتوں) کیلئے مشکل ہے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہم پر آسان کر دیا گیا ہے جو چیز انبیاء کے راستے میں مشکل تھی وہ آہستہ آہستہ ہمارے لئے آسان ہو گئی۔ افلاک وکواکب میں ہمارے لئے جانا مشکل نہیں ہے کیونکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم عرش علاء پر گئے اور موسیٰ کوہ طور پر یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے مہمان بن کر آئے حضرت جبریئل ملائکہ کے ہمراہ ان کے دربان ہیں۔ تیز رفتار براق میرے نیچے ہے۔ صحرائے لایزل ہمارے لئے میدان بن گیا ہے۔ اس بارگاہ میں وحدت وکثرت کا کیا کام ہے وہاں تو لاکھوں ایک ہو جاتے ہیں جس ذات کی ظاہری شکل وصورت نہیں۔ وہ ہمارے لئے عیاں ہو گئی

ہے۔ حق تعالیٰ کا دیدار اس کے پروانے تنہائیوں میں کرتے ہیں۔ اس کا دیدار ہمارے لئے آسان ہو گیا ہے۔ اس عظیم ہستی کا دیدار مسکرتی ہوئی کلیوں میں موجود ہے۔ اس کے دیدار سے عجیب وغریب امور کا کشف ہوتا ہے کیونکہ اس کے بتائے اوصاف سے ہم نے اس کا دیدار کرلیا ہے لیکن یہ سب کچھ معرفت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ میں نے دنیا کے بت خانوں کی بہت سیر کی ہے افسوس کہ لوگوں نے خود پرستی ہی کو ایمان سمجھ لیا ہے اس کی رحمتوں کا سمندر بہت طولانی ہے اس کو دیکھنا ہو تو ایسی کشتی سے دیکھو کہ جس کی کوئی انتہا نہ ہو۔ اے عثمان یہاں پر لوگوں کا محتاج نہ رہ کیونکہ تو تو یزداں کی اطاعت میں آ گیا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں ایک منقبت کے چند بند دیکھئے۔ اس میں وابستگی اور اپنی بے خودی کا اظہار کتنی شدت سے کیا جا رہا ہے۔

جام مہر علی ز در دستم
بعد از جام خرد ام مستم
کمر اندر قلندری بستم
از دل پاک حیدری ہستم
حیدری ام قلندرم مستم
بندۂ مرتضیٰ علی ہستم

ترجمہ:

۱۔ میں نے محبت علی رضی اللہ عنہ کا جام تھاما ہے جام عقل کے بعد اس نشے میں مست ہوں میں نے قلندر ہونے پر کمر کس لی ہے میں دل و جان سے حیدری ہوں میں حیدری، قلندری ہوں، جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا غلام ہوں۔

۲۔ از مئے عشق شاہ سر مستم
بندہ مرتضیٰ علی ہستم

من بغیر از علی ندا نستم
علی اللہ از ازل گفتم
حیدری ام

ترجمہ:

میں مستوں کے سردار کے عشق کا جام پیئے ہوئے ہوں۔ علی المرتضٰی کا ادنیٰ سا غلام ہوں۔ میں علی کے بغیر کسی کو نہیں پکارتا کیونکہ ازل سے اللہ تعالیٰ کا ایک نام علی ہے میں نے ہمیشہ اس کو اسی نام سے پکارا ہے۔ میں حیدری ہوں۔

۳- اسد اللہ است ید اللہ است
ولی اللہ است مظہر اللہ است
حجت اللہ قدرت اللہ است
بے نظیر ذات اللہ است
حیدری ام

ترجمہ:

وہ اسد اللہ ہیں، ید اللہ ہیں، ولی اللہ ہیں، مظہر خدا ہیں، حجت خداوندی ہیں، قدرت الٰہی ہیں، بے شک اللہ تعالیٰ کی ذات بے مثال ہے...... میں حیدری ہوں۔

۴- شاہ اقلیم ہل اتی خوانم
مالک تخت، قل کفٰی خوانم
صاحب سیف لافتیٰ خوانم
والئ تاج انما خوانم
حیدری ام

ترجمہ:

میرے نزدیک وہ اقلیم ہل اتی کے بادشاہ ہیں، تخت قل کفی کے مالک ہیں، سیف

لافتی کے پیرو ہیں' تاج انما کے سلطان ہیں...... میں حیدری ہوں۔

۵- آنچہ در وصف مرتضیٰ گفتم
باز قول مصطفیٰ' گفتم
حرف حق است برشما گفتم
سر اسرار برملا گفتم
حیدری ام

ترجمہ:

میں نے جو کچھ شانِ علی مرتضیٰ میں کہا ہے (یہ اپنی طرف سے نہیں کہا) بلکہ فرمان مصطفیٰ کہا ہے میں نے جو کچھ بھی آپ سے بیان کیا ہے یہ اسرارِ حق ہے...... میں حیدری ہوں۔

ان اشعار کو بنیاد بنا کر بعض حضرات نے سید عثمان مروندی جیسے جلیل الشان ولی کو ایک خاص مسلک سے منسلک کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسا ہرگز نہیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ان کی اولاد بارے ہر سچا فقیر اور صوفی ایسے ہی جذبات رکھتا ہے جن کا اظہار قلندر پاک نے فرمایا ہے۔

حضرت شہباز قلندر نے کئی غزلیں بھی کہی ہیں۔ ان میں سے چند بطور تبرک دیکھئے:

گر خدارا دوست داری خامشی باید گزید
باہزاراں شور وزاری خامشی باید گزید

چون زباں بندی دلت ہم خندواز فرخندگی
ہمچو گلہائے بہاری خامشی باید گزید

خامشی مس وجودت را کند زر بے خلاف
در دو عالم سربرآری خامشی باید گزید

دار دائم در حضور دوست خود رادم بدم
جملگی باحق سپاری خامشی باید گزید

در زمین دل ہمیں تخم محبت رابکار!
زآب دیدہ کشت کاری خامشی باید گزید

گفتگو باد خزاں است و بہاری قلب را
نیست روے رستگاری خامشی باید گزید

دمبدم چوں باغبان شو پاسبان باغ دل
یک زماں غفلت نیاری خامشی باید گزید

درطلبگاری و صالش بندہ عثماں ببیں
میکند شب روززاری خامشی باید گزید

ترجمہ:

اگر خدا کو دوست بنایا ہے تو چپ اختیار کرنی چاہیے اور ہزاروں شور اور آہ وزاری سے خاموش رہنا چاہیے۔

جب زبان بند ہے اور دل بھی خوشی سے مسکرائے تو بہار کے پھول کی طرح خاموش رہنا چاہیے۔

خاموشی تیرے وجود کے تانبے کو کندن بنادیتی ہے۔اس لئے خاموشی اختیار کرنی چاہئے۔

اپنے دل کی زمین میں بھی محبت کے بیج کو بودے اور آنسوؤں سے اس کی پرورش کرنا چاہتا ہے تو خاموشی اختیار کر۔

دل کی بہار کیلئے گفتگو بادِخزاں ہے اس لئے خاموش رہ۔

ہر لحظہ باغبان کی طرح دل کے باغ کی حفاظت کر، کسی وقت بھی غفلت نہ کر خاموش رہ۔

اس کے ساتھ ملاپ چاہتا ہے تو عثمان کو دیکھ جو دن رات زاری کرتا ہے، خاموش رہ۔

غزل

کمند عشق درگردان مرامسر ور خوش آید
خم و خمار و خرم ہم ازاں مخمور خوش آید

تجلی جلالم کرد موسے رابہ بے ہوشی
بہ بین کار جلالم راکہ چوں برطور خوش آید

بیا اے مرد ورازے بین ازیں جاتو چرالرزی
شہنشاہم بیزم من ہمہ مذکور خوش آید

قلندر من وشہبازم مرا آشیانہ گوناں گوں
بہر جا میر دم آنگاہ بامن نور خوش آید

ترجمہ:

میری گردن میں عشق کی کمند مجھے بہت پیاری ہے۔ اس نشے میں مست رہنا مجھے اچھا لگتا ہے۔

میرے جلال کی تجلی نے موسیٰ کو بے ہوش کر دیا۔ میرے اس جلال کو دیکھو کہ طور پر کتنا پیارا لگتا ہے۔

اے شخص آ اور اس راز کو دیکھ کہ اس جگہ تو کیوں کپکپا رہا ہے۔ میں اپنی بزم کا بادشاہ ہوں اور مجھے یہ سب بزم آرائیاں اچھی لگتی ہیں۔

میں قلندر ہوں اور شہباز ہوں میرا آشیانہ طرح طرح کی جگہیں ہیں جہاں میں جاتا ہوں وہاں یہ نور مجھے اچھا لگتا ہے۔

غزل

زغم خواری غم غم غم غریبم
ندارم جز غم غم غم غریبم !

نماندہ درد لم جز غم غریبی
غریبی در غریبی ام غریبم !

نماندہ درد لم غم غیر جاناں
غمش را دوستم ہر دم غریبم

ندارم بے غمی را طاقت آورد
بغم خوکردہ ام چوں غم غریبم

بجز غم خواری عشقت ندارم
وگر کارے ازاں باغم غریبم

غم عشقت دلم را تازہ دارد
ہمیں بس درد رامرہم غریبم

چو عثمان جان و دل و جاں بپیشش
بغم شو آشنا ہر دم غریبم!

ترجمہ:

میں اس غم کی غمخواری سے غریب ہوں اس کے سوا میرے پاس کچھ نہیں ہے۔

میرے دل میں غربت کے غم کے سوا کچھ نہیں رہا۔ میں اس غربت میں اور بھی غریب ہوں۔

میرے دل میں غم جاناں کے سوا کچھ نہیں بچا۔ اس کا غم مجھے پیارا ہے جس کی وجہ سے میں ہر وقت غریب ہوں۔

غم کے بغیر میرے پاس کچھ نہیں کہ جو مجھے تقویت دے میں نے اس لئے غم کو اپنی عادت بنالیا ہے۔

تیرے عشق کی غمخواری کے سوا مجھے اور کوئی کام نہیں۔ اسی غم سے میں غریب ہوں۔

تیرے عشق کے غم نے میرے دل کو شگفتہ بنا دیا ہے۔ یہی میرے درد کا مرہم ہے۔

عثمان نے جب اپنے جان و دل اس کے سامنے حاضر کیے تو اپنے غم سے آشنا ہوا ہر دم غریب ہوا۔

سندھ کے ایک زبردست عالم مخدوم میاں عبدالواحد سیوستانی اٹھارویں صدی عیسوی میں گزرے ہیں جنہوں نے اپنی کتاب ''فتاویٰ واحدی'' میں لکھا ہے کہ حضرت قلندر شہباز کبھی کبھی وجد کی حالت میں شعر کہتے رہتے تھے۔ انہوں نے اس ضمن میں مندرجہ ذیل غزل بطور مثال پیش کی ہے:

زعشق دوست ہر ساعت درون ناری رقصم
گہی برخاک می غلطم گہی بردار می رقصم
شدم بدنام در عشقش بیا ای پارسا اکنون
نمی ترسم ز رسوائی بہر بازار می رقصم
بیا ای مطرب و ساقی سماع و شوق راور دہ
کہ من از شادی وصلش قلندر داری رقصم
اگر صوفی شدن خواہی بیا تاخرقہ پوشانم
چہ خوش زنار بربستم بہ ایں دیدار می رقصم
مرا مخلوق میگوید گدا چند ان چہ می رقصی
بدل داریم اسرارے ازاں اسرار می رقصم
خلائق گر کند بر من ملامت زیں سبب ہر دم
مگر نازم برایں ذوقیکہ پیش یار می رقصم

ترجمہ:

محبوب کے عشق میں میں ہر وقت آگ پر رقص کرتا ہوں۔ کبھی خاک میں لوٹتا ہوں اور کبھی سولی پر چڑھتا ہوں۔

میں اس کے عشق میں بدنام ہوا۔ اے پاکباز اب آجا میں رسوائی سے نہیں ڈرتا اور ہر بازار میں کھلے عام ناچتا ہوں۔

اے مطرب و ساقی آ اور سماع اور شوق لے کر پہنچ کہ میں اب اس کے وصل کی

خوشی میں قلندرانہ طور پر ناچ رہا ہوں۔

اگر تم صوفی بننا چاہتے ہو تو آؤ تا کہ تمہیں خرقہ پہنا دوں۔ کیا خوبصورت زنار پہنا دیا ہے کہ میں اسے دیکھ دیکھ کر ناچ رہا ہوں۔

لوگ کہتے ہیں کہ اے گداگر کیوں ناچ رہے ہو۔ میرے دل میں وہ راز کی طرح پوشیدہ ہے اس کی وجہ سے میں ناچ رہا ہوں۔

اگرچہ دنیا والے مجھ پر اس کے باعث ملامت کرتے ہیں مگر مجھے اس ذوق پر ناز ہے کہ اپنے محبوب کے سامنے ناچ رہا ہوں۔

ڈاکٹر عبدالمجید سندھی کی تحقیق کے مطابق ایک قلمی نسخے میں حضرت خواجہ عثمان ہارونی کی غزل کا مطلع ہے۔

نمی دانم کہ آخر چوں دم دیدارِ می رقصم
مگر نازم بہ ایں ذوقے کہ پیش یار می رقصم

منم عثمان مروندی کہ یار خواجہ منصورم
نہ لرزم از ملامت آں کہ من بر دار می رقصم

من آں درم کہ بحر جلال اللہ بوداستم
بکوہ طور باموسیٰ کلیم اللہ بوداستم

بہ آبی زندہ ہم بودم بہ خضری زندہ بوداستم
بہ اسکندر درآن لشکر بہ لشکر گاہ بوداستم

بہ اسماعیل پیغمبر بہ ابراہیم بن آذر

در آن سروقت قربانی بہ قربان گاہ بوداستم

گہی بر تخت گریانم گہی بردار خندانم!
گہی در مذہب ترسا لبے محنت کشیداستم

دو صد جامہ کہن کردم لباس فقر پوشیدم
برآن برجی کہ من بودم ہزاراں یک رسیداستم

ایا عثمان مروندی چرامستی در ایں عالم
بجز مستی و مدہوشی وگر چیزی نہ دانستم

قلندر نامہ کے مصنف نے پہلی غزل شیخ عثمان انصاری اور دوسری شمس تبریزی کی قرار دی ہے لیکن یہ دونوں غزلیں شیخ عثمان انصاری کے ''عشقیہ'' اور شمس تبریزی کی کلیات میں نہیں ملتیں۔

حقیقت میں حضرت شمس تبریز کی ایک غزل اسی زمین میں ہے جس وجہ سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی ہے۔

سندھ اور برصغیر کے دیگر مؤرخین نے حضرت شہباز قلندر کو باقاعدہ شاعر تسلیم کیا ہے۔ مولانا محمد ہاشم ٹھٹوی کی کتاب ''مدح سندھ'' میر علی شیر قانع کی کتاب ''مقالات الشعراء'' حضرت قادر بخش بیدل کی کتب ''سندالموحدین'' اور ''رموز العارفین'' (قلمی) مہتا مولچند کی کتاب ''رسالہ سوانح قلندرؒ'' (قلمی) ایک اور قلمی کتاب ''بیاض صالح (قلمی) اور خداداد خاں کی کتاب ''لب تاریخ سندھ'' میں ان کے اشعار دیئے گئے ہیں۔

اس کے علاوہ بہت سی بیاضوں اور قلمی نسخوں میں بھی ان کے اشعار قلمبند ہیں۔

بہت سے فقراء اور درویشوں کی زبانوں پر ان کے اشعار ورد ہیں۔

ڈاکٹر ہرومل سدارنگانی نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ PERSIAN POETS OF SIND ''میں انہیں سندھ کا پہلا شاعر قرار دیا ہے۔

آپ کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ بھی ملا ہے۔ اس میں راجہ تخلص کی جتنی غزلیں آئی ہیں وہ حضرت قلندر شہباز کی نہیں ہیں وہ سید جلال الدین بخاری کے پوتے راجو قتال کی ہیں جن کا تخلص ''راجہ'' تھا۔ راجو قتال کے ''دیوان راجہ'' کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔

حضرت قلندر لعل شہباز سے ایک کتاب ''عشقیہ'' منسوب ہے جس میں کچھ اشعار بھی ہیں۔ اس عشقیہ نام کی وجہ سے ایک غلط فہمی بھی ہے وہ یہ کہ سترھویں یا اٹھارویں صدی میں ایک عارف حضرت شیخ عثمان انصاری' قادری' نقشبندی بھی گزرے ہیں جن کی کتاب بھی اسی نام سے منسوب ہے۔ قلندر نامہ کے مصنف مولانا حکیم فتح محمد سہوانی مذکورہ کتاب کو حضرت قلندر شہباز کی شاعری تسلیم نہیں کرتے اور ان کی رائے میں یہ کتاب شہباز قلندر کی اس لئے نہیں ہو سکتی کہ اس میں حافظ اور جامی کے اشعار شامل ہیں جو شہباز قلندر کے ایک عرصہ بعد گزرے ہیں۔